www.urduchannel.in

تیسرا مجموعۂ نظمیات

(جملہ حقوقِ اخذ و نقل و طباعت محفوظ)

بارِ اوّل ۱۰۰۰

دسمبر ۱۹۴۷ء

قیمت ..... ۲؎

ناشر

مکتبۂ قصر الادب آگرہ

مطبوعہ آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ

عنوانیہ

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	طوفان کی گرج	۷
۲	جاگ اے ہندوستاں	۱۳
۳	ہندوستاں خطرے میں ہے	۱۷
۴	خطرہ	۱۹
۵	دُنیا کی حیاتِ نو	۲۱
۶	کارواں کی پکار	۲۴
۷	ارضِ تاج سے ایک پیغام	۲۷
۸	ایک انتباہ	۳۰
۹	امیدیں، حوصلے	۳۳
۱۰	ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو	۳۵
۱۱	اذانِ شاعر	۳۷
۱۲	ناگزیر	۳۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۳	سفینۂ شکستہ کے مسافرے!	۴۰
۱۴	بازیگرانِ قوم سے	۴۲
۱۵	صورِ تخریب	۴۴
۱۶	آہنگِ وقت	۴۶
۱۷	اے ہندوستاں	۴۸
۱۸	جاہل باش و خوش باش	۵۰
۱۹	خاموشی	۵۱
۲۰	وقت کا مطالبہ	۵۳
۲۱	شکستِ جمود	۵۶
۲۲	تم سے کچھ کہنا ہے اے اقوامِ شرق!	۵۸
۲۳	نئی ہوائیں	۶۰
۲۴	گلبانگِ بہار	۶۴
۲۵	اے حجرہ نشینو!	۶۶
۲۶	نوروزِ مشترک	۷۰
۲۷	اے گوشہ نشیں اُٹھ!	۷۲
۲۸	کلکتہ	۷۴
۲۹	شاعر اور جنگ	۷۶
۳۰	صبحِ بنارس	۷۸
۳۱	ایثار	۸۰
۳۲	اُجالا بندی	۸۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۳۳	دعوتِ تجدید	۸۵
۳۴	دعوتِ جشنِ عید	۸۸
۳۵	نمازِ عید اور محاسبۂ ضمیر	۹۱
۳۶	عیدِ امروز	۹۳
۳۷	میں عید کیا مناؤں!	۹۵
۳۸	افقِ بعید پر ایک طائرانہ نظر	۹۸
۳۹	آویزۂ نیلوفری	۱۰۳
۴۰	آج کی بیٹی اور کل کی ماں	۱۰۸
۴۱	بھوکا ہندوستان	۱۱۰
۴۲	اپنی اپنی جگہ	۱۱۲
۴۲	بوڑھی بھکارن	۱۱۴
۴۴	مراحِل	۱۱۶
۴۵	نیا محاذ	۱۱۷
۴۶	چاند پر تنقید	۱۱۹
۴۷	پھوٹ کا گیت	۱۲۱
۴۸	چراغانِ وطن	۱۲۳
۴۹	ارتقا	۱۲۵
۵۰	بحرانِ آزاد	۱۲۷
۵۱	نظر و خبر	۱۲۹
۵۲	گرزِ گراں	۱۳۱

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۵۳	احساس کی کروٹیں	۱۳۴
۵۴	ابھی قدم نہ روک	۱۳۷
۵۵	حکمتِ انسانی کو چیلنج	۱۴۰
۵۶	انقلاب زندہ باد	۱۴۲
۵۷	ہمالہ کی چوٹی سے	۱۴۴
۵۸	شملہ کانفرنس	۱۴۶
۵۹	زوالِ عالم	۱۴۸
۶۰	وقت کی نبضیں	۱۵۰
۶۱	اے مجلسِ امن وسلام (شاعرِ امن وسلام کا ایک مشورہ)	۱۵۳
۶۲	اے شاعرِ امن وسلام (مجلس امن وسلام کا جواب)	۱۵۵
۶۳	سرحدِ ہندوستاں سے ایک پیام	۱۵۷
۶۴	منزل قریب تر ہے	۱۶۲
۶۵	ماؤیت	۱۶۵
۶۶	مرے وطن کی فضائیں	۱۶۸
۶۷	تبدیلیاں	۱۷۰
۶۸	افکارِ پریشاں	۱۷۲
۶۹	سیاسی غزل	۱۷۴

طوفان کی گرج

اسی جانب ہے کیا رفتار امواجِ پریشاں کی
مسلسل آرہی ہے کان میں آواز طوفاں کی
اسی جانب بڑھا آتا ہے سیلابِ فنا ساماں
جہنم در نفس، دوشہ بکف، طوفان در داماں
چٹانیں جس قدر بھی راستے میں اس کے آتی ہیں
وہ اس کی ٹھوکروں سے پس کے پانی ہوتی جاتی ہیں
سفینے اور جہاز اڑتے ہیں آتشبار پھونکوں سے
سمندر آگ بن جاتا ہے اس کے گرم شعلوں سے
بھرے کھیتوں کو تل پٹ کر دیا ہے تند موجوں نے
چمن ویراں کئے ہیں اس کی بے ترتیب فوجوں نے

تباہی عالمِ انسانیت میں اس نے ڈالی ہے
کروروں ایسی مائیں ہیں کہ جن کی گود خالی ہے
یتیم اس نے کیا بچوں کو اور بے چارگی دیدی
جوانی میں سہاگن عورتوں کو بیوگی دیدی
کیے تہذیب کے ٹکڑے تمدن کو مٹا ڈالا
جو تھے تعمیرِ عالم کا سبب اُن کو مٹا ڈالا
صدا پردے میں اس کے گونجتی ہے اک درندے کی
جسے ہے جوش میں پروائہ مُردے کی نہ زندے کی
ہزاروں مقبرے روندے گئے رفتار سے اِس کی
زمیں کے دل پہ گہرے زخم ہیں تلوار سے اس کی
ہزاروں قصر و ایواں کر دئے برباد دنیا میں
نہیں جنگل سے اس کے کوئی مُلک آزاد دُنیا میں
سکون و امن کی لاشیں کچلتا اور تبسر توڑے
ہلاکت کا فرشتہ آرہا ہے اپنے پَر توڑے
حوادث کے تھپیڑے بے تحاشا ساتھ ہیں اسکے
رگِ ہستی پہ قابو یاب دونوں ہاتھ ہیں اِسکے

نظر آتی ہیں اس کی شورشیں مشرق کے ساحل سے
مگر مشرق کو فرصت ہی نہیں اشغالِ باطل سے
نہیں اربابِ ساحل پر اثر آثارِ طوفان کا
ہے ان پر خواب طاری اب بھی دورِ امن سالاں کا
وہی رقص و اداکاری وہی نغمات و سازِ ابتک
وہی ہے گرمیِ ساحل سُرودِ دلنواز اب تک
وہی ساقی وہی مینا، وہی ساغر، وہی بادہ
وہی سفلہ پرستی رندی و مستی پر آمادہ
وہی عشوہ فروشی ہے صنم خانوں کی راہوں میں
وہی مردہ پرستی ہو رہی ہے خانقاہوں میں
وہی شعروں میں فرضی حسن کاری ہے تخیل کی
وہی نازش ہے دفنائے ہوئے جاہ و تجمل کی
وہی ہیں بین الاقوامی مباحث ہر طرف جاری
غلامی کی وہی پھیلی ہوئی ہے ان میں بیماری
وہی جلسے، وہی سیریں، وہی تفریح خانے ہیں
پذیرائی ہوس کی ہے، محبت کے بہانے ہیں

برہنہ سر ہیں لیکن اب بھی نازِ کجکلاہی ہے
ہیں فاقہ مست، اس پر بھی دماغِ بادشاہی ہے
مسلّط ہے بلا کی طرح ان پر خوابِ غفلت کا
وہی کابوس نخوت کا وہی سودا جہالت کا
یہ سُن سکتے ہیں در پردہ نوا سازِ رگِ جاں کی
نہیں آتی صدا کانوں میں لیکن شورِ طوفاں کی
نہیں معلوم یہ طوفان کب مشرق پہ چھا جائے؟
کب ان اونگھی ہوئی بیداریوں کو نیند آجائے؟
کیا ہے وقت نے جو وار وہ خالی نہ جائے گا
صدا طوفاں کی آج آتی ہے، کل طوفاں بھی آئے گا
بہت پھونکے ہیں میں نے صور ان کی خوابگاہوں میں
بنا ناقوسِ بت خانہ، اذاں دی خانقاہوں میں
فنا کی آخری ٹھوکر جگانے آئی ہے ان کو
پیامِ آخرِ فطرت سنانے آئی ہے ان کو
کہ جن قوموں کا غفلت اور عشرت کام ہوتا ہے
جہاں میں ان کا مستقبل فنا انجام ہوتا ہے

کہاں ہیں وہ مدبر جن کو دعوائے سیاست ہے؟
کہاں ہیں وہ مفکر جن کو زعمِ علم و حکمت ہے؟
کہاں ہیں جلوۂ اسرارِ پنہاں دیکھنے والے؟
کہاں ہیں اک نظر سے نبضِ طوفاں دیکھنے والے؟
کہاں ہیں وہ مزاج آگاہ رزم و بزمِ امکاں کے؟
کہاں ہیں وہ شناور تلزمِ ادراک و عرفاں کے؟
کہاں ہیں وہ علمبردار خالدؓ اور حیدرؓ کے؟
کہاں ہیں آزمودہ کار ماضیاتِ خیبر کے؟
کہاں ہیں بھیشم و ارجن سے رشتہ جوڑنے والے؟
کہاں ہیں اپنے سر آپس میں لڑ کر پھوڑنے والے؟
کہاں ہیں کوندنے والے مجالس اور سبھاؤں میں؟
کہاں ہیں اُڑنے والے لفظ و معنی کی ہواؤں میں؟
کہاں ہیں انقلابِ وقت کا منھ پھیرنے والے؟
کہاں ہیں گردشوں کو زد میں لا کر گھیرنے والے؟
کہاں ہیں وہ جو کہتے تھے کہ جب ہم مسکرا دیں گے؟
تو عقل و ہوش کے انبار پر بجلی گرا دیں گے

کہاں ہیں وہ جو کہتے تھے وطن کے پاسباں ہیں ہم؟
نہیں صیاد و گلچیں، ذمہ دارِ آشیاں ہیں ہم
کہاں ہیں ناخدایانِ وطن اب سامنے آئیں؟
سفینہ ڈوبتا ہے ڈوبتے کو تھامنے آئیں
کوئی ہے روک دے جو انقلابِ حشر ساماں کو؟
کوئی ہے جو بدل دے حاصلِ تقدیرِ طوفاں کو؟
نظامِ حال بعد از وقت بھی ہے اور مشکل بھی
کہ اب ساحل بھی خطرے میں ہے موجودات ساحل بھی

جاگ اے ہندوستاں!

انقلابِ وقت کا سورج ہے سر پر ضوفشاں — جاگ اے ہندوستاں!
اور تو اب تک ہے محوِ غفلت خوابِ گراں — جاگ اے ہندوستاں!

امن کے ڈاکو کنارے تک وطن کے آ گئے — سر پھرے صیاد ڈانڈے تک چمن کے آ گئے
جوش میں بدخواہ شیخ و برہمن کے آ گئے — قہر بن کر آ گئے طوفان بن کے آ گئے

وار سوتے میں نہ کر دیں دشمنِ امن و اماں
جاگ اے ہندوستاں!

اپنے باغوں اور اپنے مرغزاروں کو بچا — اپنے دریاؤں کو، اپنے کوہساروں کو بچا
پائمالی سے بزرگوں کے مزاروں کو بچا — جن سے تو جنت بنا ہے اُن بہاروں کو بچا

ورنہ پھر یہ کھیت اور یہ چاندنی راتیں کہاں!
جاگ اے ہندوستاں!

یہ بہشتِ تاج، شالامار کا یہ کیف زار — چار مینار اور سانچی اور ایلورا کے غار
بندرابن کے شوالے اور طلائی گورد وار — جامعِ دہلی کی رفعت اور گوکل کا وقار
مٹ نہ جائیں عظمتِ ماضی کے یہ نام و نشاں
جاگ اے ہندوستاں!

موقعِ ضبط و سکوں اپنے پریشانوں کو دے — قوتِ خود اعتمادی مضطرب جانوں کو دے
وقت کا احساس قومیت کے دیوانوں کو دے — درسِ ربطِ باہمی ہندو مسلمانوں کو دے
پھر کبھی فرصت میں سلجھا لیں گے اپنی گتھیاں
جاگ اے ہندوستاں!

مشرق و مغرب میں دیوِ جنگ ہے آشفتہ سر — ایشیا پر بھی ہلاکت خیز ہے اس کی نظر
ہر طرف چھایا ہوا ہے موت کا خوف و خطر — یورشِ امواج سے سہمے ہوئے ہیں بحر و بر
آگ اور بارود سے دہکا ہوا ہے آسماں
جاگ اے ہندوستاں!

تیرے مزدوروں، کسانوں کو مٹانے کیلئے — تیرے ایوانوں، مکانوں کو مٹانے کیلئے
تیرے رنگیں عیش خانوں کو مٹانے کیلئے — تیرے محفوظ آشیانوں کو مٹانے کیلئے
جبر و استبداد کی اٹھی ہیں کالی آندھیاں
جاگ اے ہندوستاں!

کیا غریبوں کے کچل جانے کا اندیشہ نہیں؟ — دشمنوں کا دار چل جانے کا اندیشہ نہیں؟
کیا فضاؤں کے بدل جانے کا اندیشہ نہیں؟ — کیا خود اپنے گھر کے جل جانے کا اندیشہ نہیں؟
کیا تصور میں نہیں ہمسائے کے گھر کا دھواں؟
جاگ اے ہندوستاں!

تیرے دروازے پہ برپا ہے قیامت کا فشار — اپنے گھر کی فکر کر ہو جا بالعجلت ہوشیار
یہ بموں کی شعلہ باری، بارشِ برق و شرار — یہ اجل کے سخت پنجے، موت کی یہ چیل پکار
اور یہ معصوم بچے، مائیں بہنیں، بیویاں!
جاگ اے ہندوستاں!

سونے والے اپنی گہری نیند سے ہشیار ہوں — دشمنانِ ہند سے آمادہ پیکار ہوں
سب محلے بستیاں محفوظ گیر و دار ہوں — سب حفاظت کے لئے اپنی جگہ تیار ہوں
یعنی ہر ہندی ہو خود اپنے وطن کا پاسباں
جاگ اے ہندوستاں!

وقت پر فتح و ظفر پانے کا اب بھی وقت ہے — غیرتوں کے جوش میں آنے کا اب بھی وقت ہے
اس تباہی سے گزر جانے کا اب بھی وقت ہے — حوصلوں کو کام میں لانے کا اب بھی وقت ہے
ہے تری ہمت کا شاید آخری یہ امتحاں!
جاگ اے ہندوستاں!

پٹ نہ جائیں خاک سے اور خون سے گنگ و جمن — آگ ہر جانب نہ برسے باغ بن جائیں نہ بن
خاک ہو جائیں نہ جل کر یہ ترے سرو و سمن — دیکھ الٹ جائے نہ یہ رنگیں بساطِ انجمن!

بے نشاں تجھ کو نہ کر دے انقلابِ ناگہاں

جاگ اے ہندوستاں!

وقت کا جو کچھ تقاضا ہے بتاتا ہوں تجھے — زندگی کے کچھ نئے آئیں سکھاتا ہوں تجھے
ساز کے پردے میں سوزِ دل سناتا ہوں تجھے — جاگ اٹھی ہیں فضائیں اب جگاتا ہوں تجھے

نغمۂ بیداب ہے بانگِ درائے کارواں

جاگ اے ہندوستاں!

ہندوستاں خطرے میں ہے!

شور ہے چاروں طرف ہندوستاں خطرے میں ہے — کیا یہ میرا خطۂ جنت نشاں خطرے میں ہے
کیا یہ میرا تاج، یہ جنسِ گراں خطرے میں ہے — کیا نشانِ عظمتِ اسلامیاں خطرے میں ہے
آشیاں سے باہر آ جا آشیاں خطرے میں ہے — آشیاں کیا اب تو سارا گلستاں خطرے میں ہے
افلاق آسودگی اب دل نہیں ہے مطمئن — رخصت اے امن و سکوں دارالاماں خطرے میں ہے
اے ہمالہ اپنی رفعت مندیوں سے ہوشیار! — چیرہ دستوں سے کلاہِ کہکشاں خطرے میں ہے
سطح سے تہہ تک زمیں ہے مرکزِ شور و شرار — ہر عیاں ہیم در جامیں ہر نہاں خطرے میں ہے
پہلے سنتا تھا جوانوں کو کوئی خطرہ نہیں — اب یہ سنتا ہوں کہ ہر پیر و جواں خطرے میں ہے
اب محافظ اپنے خود ہو جائیں افرادِ وطن — پاسباں کا کیا بھروسہ، پاسباں خطرے میں ہے
چاند، سورج اور تاروں میں ہیں کچھ سرگوشیاں — شورشِ اہلِ زمیں سے آسماں خطرے میں ہے
ہستیٔ طوفاں زدہ کا اب خدا ہے ناخدا — بادباں خطرے میں ہے، آبِ رواں خطرے میں ہے

جستجو تھی جس کی صدیوں سے وہ منزل آگئی
کارواں کے ساتھ میرِ کارواں خطرے میں ہے

تھا جرس سا درا داں سے پہلے خطرہ ملک کو
اب جرس خود خوف میں ہے، خود اذاں خطرے میں ہے

امن پائے گا کہاں غارت گرِ امنِ جہاں؟
باغ کو تاراج کر کے باغباں خطرے میں ہے

اب تو ہے اقلیم در اقلیم خطرے کا گزر
اب یہ کیا کہئے فلاں ابنِ فلاں خطرے میں ہے

کود پڑ خطرے میں بے خوفی و آزادی کے ساتھ
بے خبر! رازِ حیاتِ جاوداں خطرے میں ہے

کیا عجب تسکینِ نوا انجام ہو خطرات کا
زادۂ فطرت! ابھی فطرت کہاں خطرے میں ہے؟

صرف اک ہندوستاں یہ آب خطرے میں نہیں
انقلابِ وقت سے سارا جہاں خطرے میں ہے

خطرہ

دل ہے خطرے میں، زباں خطرے میں، سر خطرے میں ہے
خیر کس کس کی منائیں گھر کا گھر خطرے میں ہے

کوہ و صحرا کو ہے خطرہ، بحر و بر خطرے میں ہے
کون ہے خطرے سے باہر تو اگر خطرے میں ہے

پُر خطر ہے ہر فضا، ہر رہ گزر خطرے میں ہے
راہ رو ضد میں ہے اور راہبر خطرے میں ہے

ہاں جہانداری کا سارا کر و فر خطرے میں ہے
ہاں کلاہ و افسر و تاج و کمر خطرے میں ہے

لیکن ان خطروں میں پڑنا اقتضائے وقت ہے
کیوں تو اتنا بے حواس و منتشر خطرے میں ہے

مطلقاً خطروں کی شدت پر نہیں میری نگاہ
دیکھنا یہ ہے کہاں تیری نظر خطرے میں ہے

مشعلِ منزل ہیں خطروں کی یہ آتش کاریاں
کامیابی کا جمالِ منتظر خطرے میں ہے

دو قدم بڑھ کر جہاں سے پھر کوئی خطرہ نہیں
زندگی کا وہ مقام بے خطر خطرے میں ہے

اتفاقی حادثوں سے اتنا گھبراتا ہے کیوں؟
زندگی تو ہر طرح اے بے خبر خطرے میں ہے

کون جانے کب بدل جائے نظامِ آفتاب
روز و شب خطرے میں ہے، شام و سحر خطرے میں ہے

ہو رہی ہے ہر طرف سے اس کی کیا کیا روک تھام
یہ بھی دیکھا تو نے "خطرہ" کس قدر خطرے میں ہے

ہمتِ انساں کے آگے سب بلائیں ہیچ ہیں
حوصلہ ہی اک فسونِ کارگر خطرے میں ہے

کعبۂ مقصود آسانی سے ملتا ہے کہیں؟
ہے وہ منزل رس جو سرگرمِ سفر خطرے میں ہے

ہے سکونستانِ بیخونی انھیں خطروں کے بعد
ہے وہ اُتنا بے خطر جو جس قدر خطرے میں ہے

خندہ زن ہو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
قہقہوں کا لطف ہے تو خاص کر خطرے میں ہے

چاہیے سیماب اندازِ سخن میں احتیاط
آج کل ہر شعبۂ علم و ہنر خطرے میں ہے

دُنیا کی حیاتِ نو

بزمِ ہستی پہ ہے چھایا ہوا اک ابرِ سیاہ
روشنی کے لئے ہر سمت بھٹکتی ہے نگاہ

کہیں ملتی ہی نہیں امن پسندوں کو پناہ
سامنے عیش و مسرت کی نہیں ہے کوئی راہ

باوجود اس کے ہے مایوسیٔ حالات گناہ
کیوں ہے یہ درد سری
سُن مری خوش خبری
"لذتِ سیرِ دگر چشمِ تماشا لے گی"
"ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لے گی"

رات کے بعد زمانے میں سحر آتی ہے
جب خزاں جاتی ہے فصلِ گلِ تر آتی ہے

جب سمٹتی ہے گھٹا، دھوپ نظر آتی ہے
چاندنی نُور کے جھولے میں اُتر آتی ہے

اب دُعا ہو کے، ہم آغوشِ اثر آتی ہے

دیکھ وہ صبح ہوئی
شبِ تاریک چلی
لذتِ سیرِ دگر چشمِ تماشا لے گی
ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لے گی

جانتا ہوں کہ تباہی ہے محیطِ عالم — عافیت سوزِ جہاں ہیں کہیں تو ہیں کہیں ہم
آج ہر سمت ہیں دنیا کی فضائیں برہم — معرضِ موت میں ہے ہستیٔ ابنِ آدم
مگر اس وقت بھی آتی ہے نوائے پیہم
ہے قیامت ابھی دُور
ابھی چُھٹکا نہیں صور
لذتِ سیرِ دگر چشمِ تماشا لے گی
ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لے گی

جوش پر جنگ کا طوفاں ہے تو مایوس نہ ہو — زندگی شعلہ بداماں ہے تو مایوس نہ ہو
مضطرب عالمِ امکاں ہے تو مایوس نہ ہو — پنجۂ موت میں انساں ہے تو مایوس نہ ہو
حال دنیا کا پریشاں ہے تو مایوس نہ ہو
رنگ بدلے گی فضا — دَور آئے گا نیا

لذتِ سیرِ دگر چشمِ تماشا لے گی
ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لے گی

جنگ کے بعد نکھر جائے گی دنیا دُھل کر — نو عروسی کا نیا اس کو ملے گا زیور
جور و بیداد کا قبضہ نہ رہے گا اس پر — اب جو مجبور ہے مختار وہ ہوگا یکسر
کوئی پابند کسی کا نہ یہاں ہوگا مگر
اک ذرا صبر تو کر
رکھ بلند اپنی نظر
لذتِ سیرِ دگر چشمِ تماشا لے گی
ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لے گی

ایک دن حال کی روداد پرانی ہوگی — سب کے ہونٹوں پہ نئی ایک کہانی ہوگی
پھر سے مشاطگیٔ عالمِ فانی ہوگی — قسمتِ دہر کہن نشأۃِ ثانی ہوگی
نئی تہذیب و تمدن پہ جوانی ہوگی
بھول اس کو نہ کبھی
پیش گوئی ہے مری
لذتِ سیرِ دگر چشمِ تماشا لے گی — ایک بار اور یہ دنیا ابھی پلٹا لے گی

کارواں کی پکار

(ساحلِ بمبئی سے مدینہ کی طرف)

ہے مسلسل اک تباہی کارواں در کارواں — اے امیرِ کارواں!
آفتابِ حشر ہے اور مطلعِ ہندوستاں — اے امیرِ کارواں!

سب تجھے معلوم ہیں جو ہو رہے ہیں واقعات
باوجودِ سعیٔ ناممکن ہے شورش سے نجات
کر دیا ہے ہم کو قسمت نے سپردِ حادثات
تھا ہمارا خون پہلے لالہ و گل کی حیات
اب ہمارے خون کی ہیں خاک پر نہریں رواں

اے امیرِ کارواں!
ہم نے پیدا راہ میں کر لی نئی مشکل تو کیا

ہو گئے گھبرا کے ہم آوارۂ منزل تو کیا
کر لئے پیدا مجازی رہبرِ باطل تو کیا
اب کوئی دو چار دن سے ہو گئے غافل تو کیا
آج تیرہ سو برس سے ہم ہیں تیرے ہم عناں

اے امیرِ کارواں!
تھی خبر آسان ہر راہِ گراں ہونے کو ہے
دفعتاً آزاد یہ ہندوستاں ہونے کو ہے
سنتے تھے منزل پہ فائز کارواں ہونے کو ہے
اب یہ سنتے ہیں کہ منزل بے نشاں ہونے کو ہے
ہم کہیں منزل سے پہلے ہو نہ جائیں بے نشاں

اے امیرِ کارواں!
ہے ہمارا عزم کانٹوں سے شگفتہ ہوں گلاب
ذرے ذرے سے ہو فطرت کی تجلّی بے نقاب
نور برساتا ہوا مشرق سے نکلے آفتاب
چاہتے ہیں ہم کریں پیدا جہاں میں انقلاب

یہ نہ ہو ہم کو مٹا دے انقلابِ ناگہاں

اے امیرِ کارواں!

بحر و بر پر آجکل چھایا ہوا ہے انقلاب
پھر بھی گردِ شور و شر سے پاک ہے تیری جناب
خلوتِ گل خانۂ طیبہ میں اے مصروفِ خواب!
نالۂ پیہم کا ملنا چاہیے کچھ تو جواب
یوں ہی چیخے جائیں کب تک؟ اے امیرِ کارواں!

اے امیرِ کارواں!

محفلِ عالم سے مٹتا جا رہا ہے نامِ امن
ہو اندھیروں ہی اندھیروں کی پیامی شامِ امن
کوہِ طائف سے اگر ممکن نہیں السامِ امن
دے ہمالہ کی بلندی سے ہمیں پیغامِ امن
اپنی آنکھوں سے اشارہ کر، کہ منزل ہے یہاں

اے امیرِ کارواں!

"ارضِ تاج" سے ایک ضروری پیغام

(محاربینِ مشرق و مغرب کے نام)

توجّہ، اے خداوندانِ تخریب! — مخاطب شاعرِ ہندوستاں ہے
صدائے دُور ہے آواز میری — مگر شائستۂ گوشِ گراں ہے
یہ "ارضِ تاج" یعنی اکبر آباد — امینِ عظمتِ ہندوستاں ہے
اسی کے سر پہ ہے وہ مرمریں "تاج" — جو نازش گاہِ اقوامِ جہاں ہے
"شبِ مہتاب و تاج" — اللہ اکبر! — یہاں راتوں کو بھی دن کا سماں ہے
یہ وہ فردوسِ ارضی ہے کہ جس میں — براہِ راست رضواں باغباں ہے
یہاں بنتے نہیں اُگتے ہیں نغمے — یہاں روحُ القدس کا آشیاں ہے
یہاں سورج نکلتا ہے ادب سے — یہاں محرومِ گردش آسماں ہے
یہاں اکبر ہے محوِ خوابِ نوشیں — یہاں خلوت گہِ شاہِ جہاں ہے

تمہاری طرح یہ بھی حکمراں تھے
مگر ان کی حکومت اب کہاں ہے؟!
ہے فانی انقلاب آبادِ ہستی
کسے حاصل حیاتِ جاوداں ہے؟

غیاث الدینِ ایرانی کا مدفن
قدیمی صنعتوں کا ترجماں ہے
یہ جامع مسجد اور یہ لال قلعہ
مغل شاہنشہی کا اک نشاں ہے
یہ شاہی باغ، یہ چینی کا روضہ
بہارِ یادگارِ باستاں ہے
یہاں شاہِ ولایتؑ کا ہے دربار
جنابِ بوالعلاؒ کا آستاں ہے
یہاں اُردو بنی بھی، اور پلی بھی
یہ اب تک مرکزِ اہلِ زباں ہے
یہ مسکن ہے مشاہیرِ ادب کا
یہاں میر اور غالب کا مکاں ہے
یہاں بہتی ہے جمنا شانتی سے
یہاں ہموارئ آبِ رواں ہے
نہفتہ ذرّے ذرّے میں یہاں کے
صنادیدِ عجم کا ہفت خواں ہے
ہر اک پتھر یہاں ہے اک فسانہ
یہاں ہر اینٹ میں اک داستاں ہے
خصوصیّت ہے ان میں کچھ تو ایسی
کہ خود فطرت بھی ان کی پاسباں ہے

نہ کرنا شعلہ باری اس زمیں پر
کہ یہ ناموس گاہِ فرشتگاں ہے

یہ ہے وہ یادگارِ عہدِ ماضی
کہ دنیا ابتک اس کی قدرداں ہے
جو ان آثار کو نقصان پہونچا
تو یہ تاریخِ عالم کا زیاں ہے
مجھے معلوم ہے اِس جنگ کا راز
یہ اک بازیچۂ بازیگراں ہے
یہ جُوعُ الارض و حرصِ ملک گیری
ہوسناک ایک سعیِ رائیگاں ہے
تسلّط اس پہ بے جا و بجا کیا
کہ دنیا چار دن کی میہماں ہے
یہ شورش ختم ہو جائے گی اکدن
فقط ذاتِ خدا ہی جاوداں ہے
ذرا بھی وقت نے کروٹ جو بدلی
تو پھر چاروں طرف امن و اماں ہے
جو تم نے ڈھا دیا ان عظمتوں کو
تو پھر تعمیر کا امکاں کہاں ہے؟
پشیمانی نہ ہو انجامِ وحشت
یہی تنبیہہ مقصودِ بیاں ہے
تمہاری قوتیں تم کو مبارک
یہ صرف انسانیت کا امتحاں ہے
مرا پیغام ہے پیغامِ فطرت
حریمِ کعبۂ دل کی اذاں ہے

محارب اپنا اپنا رُخ بدل لیں
ابھی بس میں درائے کارواں ہے

ایک انتباہ

(بدھ مندر (گیا) کی سقفِ بلند سے جاپان کو)

میں بدھ مندر گیا کی سقفِ کہنہ پر ہوں استادہ
طبیعت جوش پر ہے، ذہن ہے طوفان آمادہ
نظر کے سامنے ہے ہند کا ماضی و مستقبل
نگاہوں کو مری عرفانِ عہدِ حال ہے حاصل
سنا ہے ہند پر حملہ فضا سے ہونے والا ہے
یہاں جاپان نے اپنا سیاسی جال ڈالا ہے
نئے فتنے اُٹھانے کی یہ سعیِ رائیگاں کیا ہے
بتانا چاہتا ہوں میں اسے، ہندُستاں کیا ہے؟
یہ گوتم کا وطن ہے کرشن کی ہے یہ جنم بھومی

یہاں شورش فضائی عقل و دانش سے ہے محرومی
یہاں ہر دوار ہے، پریاگ ہے اور بندرابن ہے
یہاں روحانیت بستی ہے، یہ روحوں کا مسکن ہے
شوالے میں گیا کے بدھ کی سنگیں یادگاریں ہیں
یہاں ہر ذرّے میں محفوظ ماضی کی بہاریں ہیں
کپل وستو، گیا اور راجگر، کاشی، کشی نارہ
رہے اسّی برس تک عارفِ ہندی کا گہوارہ
یہاں کی خاک پر برسوں پڑے ہیں پاؤں گوتم کے
ابھی موجود ہیں اس سرزمیں میں گانوں گوتم کے
وہ گوتم بدھ، اہنسا جن کا مشرب، تیاگ مذہب تھا
وہ دنیا دار ہو کر سب سے پہلے تارک الدُّنیا
گیا سے تبت اور جاپان تک گونجی صدا جن کی
ابھی جاپان والوں میں پرستش ہے رواجن کی
پرانی مورتیں بدھ کی یہاں محفوظ ہیں اب تک
وقارِ رفتہ کے دُھندلے نشاں محفوظ ہیں اب تک

یہ آثارِ قدیم اس ملک میں عزت کے قابل ہیں
نقوشِ عہدِ ماضی ہیں مگر عبرت کے قابل ہیں

یہ بودھ کا مٹھ اگر ویران ہو جائے عجب کیا ہے
لڑائی کا جسے سب دیوتا کہتے ہیں "اندھا" ہے

کہے دیتا ہوں میں جاپان کے خورشید زادوں سے
ابھی ہے وقت باز آ جائیں اپنے اِن ارادوں سے

ارادے کے بدل دینے میں اتنی دیر کیا معنی؟
یہ ہیں - اولاد سورج کی تو پھر اندھیر کیا معنی؟

یہ حرصِ ملک گیری اک بلا ہے ایک لعنت ہے
جو کچھ ابتک ملا "سورج" کے سائے میں غنیمت ہے

"گرو کا دیش" اگر محرومِ امن و عافیت ہوگا
گرو کی بددعاؤں سے زوالِ سلطنت ہوگا

دل اُس کے بھکشوؤں کا نالہ و فریاد کرتا ہے
کوئی اپنے پیمبر کا وطن برباد کرتا ہے؟!

اُمیدیں حوصلے

شکارِ انقلابِ عالم ایجاد کیوں ہوگا؟
خدا ناخواستہ میرا وطن برباد کیوں ہوگا؟

مجسّم شاہکارِ ذہنِ فطرت ہے وطن میرا — تجلّی گاہِ رومان و محبت ہے وطن میرا
کہن گہوارۂ آثارِ عظمت ہے وطن میرا
یہ گہوارہ رہینِ پستیِ افتاد کیوں ہوگا؟ — خدا ناخواستہ میرا وطن برباد کیوں ہوگا؟

ہُوا ہے صبح اور شامِ چمن کا تجربہ جس کو — مسلسل ہے درد و بامِ چمن کا تجربہ جس کو
ہے پورا دانہ و دامِ چمن کا تجربہ جس کو
وہ دانستہ غلامِ صیدی و صیاد کیوں ہوگا؟ — خدا ناخواستہ میرا وطن برباد کیوں ہوگا؟

غلامی ہی میں توڑے اپنا دم یہ ہو نہیں سکتا　　قیامت تک رہے پابندِ غم یہ ہو نہیں سکتا
ستم ہو اس پہ بالائے ستم یہ ہو نہیں سکتا
سزاوارِ کرم ہے موردِ بیداد کیوں ہوگا؟　　خدانا خواستہ میرا وطن برباد کیوں ہوگا؟

ودیعت فطرتاً جس کو ہوا سودائے آزادی　　جو برسوں سے ہے وقفِ حسرتِ لیلائے آزادی
جسے حاصل نہ ابتک ہو سکا طغرائے آزادی
ابھی وہ قیدِ ہست و بود سے آزاد کیوں ہوگا؟　　خدانا خواستہ میرا وطن برباد کیوں ہوگا؟

ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو

وطن اندیشۂ بیم و رجا سے سرگراں کیوں ہے؟　　بپا شورش خلافِ دولتِ ہندوستاں کیوں ہے؟
سکوں گاہوں سے نغمے ابر بنکر کیوں نہیں اٹھتے؟　　زبانوں پر حدیثِ غارتِ امن و اماں کیوں ہے؟
یہ مشرق ہے یہاں راتوں کو بھی ظلمت نہیں ہوتی　　تو ہر جانب چراغِ زیرِ داماں کا سماں کیوں ہے؟
جرس کی گونج تھرائی کیوں ہے شوالے میں؟　　حدِ مسجد میں بھرائی ہوئی بانگِ اذاں کیوں ہے؟
تحفظ کا یہاں کیوں ہو رہا ہے اہتمامِ نو؟　　جو تھی مغرب کی قسمت میں وہ بے چینی یہاں کیوں ہے؟
ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو!

جوانانِ وطن اس وقت کیا کام آ نہیں سکتے؟　　قوی تدبیر کیا کوئی عمل میں لا نہیں سکتے؟
مہارت ہے انھیں "کرکٹ" میں بازو آزمائی کی　　تو کیا پتھر فضائے جنگ پر برسا نہیں سکتے؟
انھیں "فٹ بال" کی تعلیم دی ہو درسگاہوں نے　　تو کیا یہ پانوں سے دشمن کا سر ٹھکرا نہیں سکتے؟
محرم میں چھری اور نیچے سے کھیلنے والے　　اس آڑے وقت میں کیا سعی کچھ فرما نہیں سکتے؟

کمان دگرز لیکر جھومنے والے "دسہرے" میں — مسلح ہو کے کیا دشمن کی لنکا ڈھا نہیں سکتے ہم

ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو!

مسلم جنگجو، جنگ آشنا، جنگ آزما ہیں یہ — بہادر ہیں شجیع و بے جگر ہیں سورما ہیں یہ

جوانانِ وطن کا زورِ بازو میں نے دیکھا ہے — فسادِ باہمی میں مدتوں سے مبتلا ہیں یہ

انھیں اب انقلابِ وقت دعوت دینے آیا ہے — حقیقت ان کی اب کھل جائیگی کتنے ہیں کیا ہیں یہ

میں امواجِ سرِ ساحل سے یہ فریاد سنتا ہوں — کہ وہ گرداب میں ہے جس وطن کے ناخدا ہیں یہ

اُٹھانے ان کو آیا ہوں بساطِ مخمل و گل سے — جگانے ان کو آیا ہوں اگر خوابِ آشنا ہیں یہ

ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو!

اذانِ شاعر

سُن اِک دلِ بیدار ہے مصروفِ فغاں سُن
ہے تا بہ زباں سلسلۂ دردِ نہاں سُن
اشکوں سے وضو کر کے میں کرتا ہوں بیاں سُن
اِک شور سا برپا ہے قریبِ رگِ جاں سُن
اے گوشِ گراں، گوشِ گراں، گوشِ گراں سُن
شاعر کی اذاں سُن!

بڑھتی ہی چلی جاتی ہے فتنوں کی کہانی
ہے اب بھی بدستور وہی شعلہ فشانی
کی اپنے وطن کی جو نہ تو نے نگرانی
کس کام پھر آئے گی یہ شہزور جوانی

لے مردِ جواں، مردِ جواں مردِ جواں سُن
شاعر کی اذاں سُن!

آسائشِ مشرق سے ہے ہیجان ہم آغوش
نرغوں سے حوادث کے ہے انسان ہم آغوش
ہے موجِ ہلاکت سے ہر ایوان ہم آغوش
اب ہند کے ساحل سے ہے طوفان ہم آغوش
اب دیر کہاں، دیر کہاں، دیر کہاں سُن
شاعر کی اذاں سُن!

برخیز کہ ہنگامِ ہلاکِ وطن آیا
کیا لالہ و گل! وقتِ وداعِ چمن آیا
وہ مرحلہ جو تھا خلشِ حسنِ ظن، آیا
ہر قافلہ تا منزلِ قبر و کفن آیا
یہ رازِ نہاں، رازِ نہاں، رازِ نہاں سُن
شاعر کی اذاں سُن!

ناگزیر

نیامِ کہنۂ ہند دستاں ہے زنگ آلود
یہاں رُکی ہوئی صدیوں سے ہیں فتوح و کشود
جلالِ تیغ و کمر صرف ہے دکھانے کو
کمالِ علم و ہنر سے غرض ہے نام و نمود
معاشرت ہو کہ مذہب ہو یا تمدّن ہو
رواج و رسمِ غلط کے سوا نہیں مقصود
اسی مٹی ہوئی تہذیب کا نتیجہ ہے!
ترنگ محلوں میں عشرت مآبیوں کا وجود
جمودِ عام یہی زادگانِ فطرت کا
مگر نہیں ابھی فطرت پر اعتبارِ جمود
ہیں انقلاب کے آثار فطرتاً پیدا
اور اب علاج ہے اس کا نہ آرتھی نہ سجود
یہ اختلاف جو پیدا ہے غلطِ مبحث سے
خلا کو بھرنے پہ مجبور ہے بدیر و بزود
بکا و نالہ سے توہینِ انقلاب نہ کر
صلائے وقت کا شکوہ گزار ہے مردود
فریبِ کوششِ اصلاحِ حال ہے بیکار
کہ ہے گرفتِ فنا میں یہ دَور نامسعود
پُر آب شد چو سفینہ ز بندِ سیل چہ سُود؟!

سفینۂ شکستہ کے مسافر سے!

اے سرد جاں مسافر! سرگرمِ کار ہو جا
جرأت سے کام لیکر طوفاں سے پار ہو جا

طوفان کی گرج میں جو آ رہی ہے پیہم
ہلہم کی وہ صدا سُن، اور ہوشیار ہو جا

ہے موجبِ تباہی تیری شکستہ کشتی
جس طرح بھی ہو ممکن اس سے فرار ہو جا

کیا ہے یہ کہنہ کشتی؟ تیرا جمودِ رسمی
ترکِ جمود کر کے برق و شرار ہو جا

طوفاں سے تا ہلاکت، ہے وقفۂ تفکر
یہ وقت ہے غنیمت، آمادہ کار ہو جا

ماحول میں نہیں ہے گر تیرے سازگاری
ماحول کے لئے تو خود سازگار ہو جا

یوں خار و خس کی صورت بہتا رہے گا کب تک؟
کوہِ گراں قدم بن اور استوار ہو جا

تیرے قویٰ میں شامل فطرت کے ہیں عناصر
خود اِک حیاتِ نو کا پروردگار ہو جا

ہے اختیار حاصل آب و ہوا پہ تجھ کو
یہ کس نے کہدیا ہے بے اختیار ہو جا

کیا دل کی دھڑکنوں میں سنتا ہے شورِ طوفاں!
سازِ خودی اُٹھا لے اور نغمہ بار ہو جا

خاکی ہے تُو، تجھے تو آتا ہے یہ ہنر بھی
سیلاب پر مسلط مثلِ غبار ہو جا

یہ ساحل و ہوا کیا کشتی و ناخدا کیا
اِن جھوٹے آسروں سے اب بے نیاز ہو جا

ٹوٹا ہوا سفینہ طوفاں کی نذر کر دے
موجیں جو اُٹھ رہی ہیں اُن پر سوار ہو جا

شمعوں سے کر کنارہ چل دل کی روشنی میں
آزادِ راہِ منزل پروانہ وار ہو جا

اب حصرِ انقلاب ذہن و نگاہ پر ہے
موقوف قربِ ساحل تغیرِ راہ پر ہے

بازیگرانِ قوم سے!

جس قدر قومیں دیارِ ہند میں آباد ہیں — فطرتاً اپنے عقائد میں وہ سب آزاد ہیں
لعنتِ بیگانگی سے مائلِ فریاد ہیں — "اتحاد" ان میں نہیں ہے اس لئے ناشاد ہیں
اتحادِ قومیت سے ان کا رشتہ جوڑ دو
ورنہ اے بازی گرو ہندوستاں کو چھوڑ دو

کون ہندو، کون مسلم سب ہیں مخلوقِ خدا — ایک ہی منزل ہے سب کی مختلف ہے راستا
رہ چکے الفاظ بے معنیٰ بہت ذہن آزما — اب ہے مقصودِ نظر انسانیت کا ارتقا
ان قدیم و کہنہ زنجیروں کی کڑیاں توڑ دو
ورنہ اے بازی گرو ہندوستاں کو چھوڑ دو

جس میں چل سکتا نہ ہو چھوت اور نفرت کا فسوں — جس کے ذرّے ہوں نہ بدنظمی کے ہاتھوں سرنگوں
جس کے رہرو کو نہ ہو ضد اور تعصب کا جنوں — جس کی حدِ آخری ہو منزلِ امن و سکوں

ملک کی باگیں اسی جادے کی جانب موڑ دو
ورنہ اے بازی گرو ہندوستاں کو چھوڑ دو

مردِ میداں ہو تو کیوں ہے حوصلوں میں برہمی! — دست و بازو بھی ہیں شل اور پائے استقلال بھی
گریۂ بے دست و پائی، نالۂ بے ہمتی! — نارسائی کی شکایت شکوۂ درماندگی!
ہیں یہ تکلیفِ خرام ان آبلوں کو پھوڑ دو
ورنہ اے بازی گرو ہندوستاں کو چھوڑ دو

صُورِ تخریب

اُٹھو زمیں کو اُلٹ دو، اُٹھو زماں کو اُلٹ دو
جہاں رہا نہیں اب کام کا جہاں کو اُلٹ دو

ہے اتفاق کہ تم چونک اُٹھے ہو نیند سے اپنی
جو وجہِ خواب ہو اُس سازِ نغمہ خواں کو اُلٹ دو

جو راستے ہوں خود اُلٹے تو کیا ہوں رہبر منزل
ہر ایک جادۂ دشوارِ کارواں کو اُلٹ دو

نہیں نوازشِ سجدہ تو سرکشی ہی بجا ہے
سکوں جبیں کو نہیں ہو تو آستاں کو اُلٹ دو

یہ دیکھنا ہے کہاں اہلِ نقصِ نشو و نما ہے
بڑھا کے دستِ جنوں صحنِ گلستاں کو اُلٹ دو

اِنھیں گھروں سے ہے انسانیت کی خانہ خرابی
حرم کی شمع بجھا دو صنم ستاں کو اُلٹ دو

براہِ راست کرو احتجاج اپنے خدا سے
جو آسمان ہو حائل تو آسماں کو اُلٹ دو

تم اپنے خون سے گلکاریاں کرو گے کہاں تک؟
نگارخانۂ صیاد و باغباں کو اُلٹ دو

جگہ تو پاؤں ٹکانے کی تم کو یوں بھی ملے گی
ہے آشیاں ہی پہ جھگڑا تو آشیاں کو اُلٹ دو

کہاں تک اِن میں یونہی کشتیاں اُلٹتی رہینگی
سمندروں میں ہر اک موجۂ رواں کو اُلٹ دو

کرے نہ بادہ فروش اہتمامِ کسل فروشی
صراحی توڑ دو، مے خانہ و دکاں کو اُلٹ دو

جلالِ فطرتِ کبریٰ ہو دست و پا میں تمہارے
تمہیں یقین ہو اس کا تو ہفت خواں کو اُلٹ دو

تمہارا جذبۂ پرواز کائنات کُشا ہے
جو چاہو تم تو ابھی تختِ کہکشاں کو اُلٹ دو

پڑی ہوئی ہیں جو لاشیں نہ ہوں گی دفن وہ کبتک؟
مکین مردہ ہوں جب کے اب اُس مکاں کو اُلٹ دو

سُنی بھی تم نے یہ سیماب کی گزارشِ تازہ
مطالبہ ہے کہ آئینِ باستاں کو اُلٹ دو

۲۰ نومبر ۱۹۴۲ء

Acc. 10727
الدین السنی فیوض الی اسلامک اسٹڈیز
منچکوٹیاں روڈ، نئی دہلی ۲

آہنگِ وقت

دیکھ کہ مشرق سے نیا "فتنۂ خاور" اُٹھا ——— سر اُٹھا
تکیۂ بالیں و رِدا پھینکدے بستر اُٹھا ——— سر اُٹھا
شورشِ ارضی تجھے دیتی ہی رہی انتباہ ——— گاہ گاہ
اب تو جہازوں کا نیا شور فلک پر اٹھا ——— سر اُٹھا
خونِ بنی آدم کا رواں ہی خس و خاشاک پہ ——— خاک پر
خاک کے ڈھالے ہوئے فتنوں سے نیا شر اُٹھا ——— سر اُٹھا
لاخرد و حوصلہ و عزم کو بروئے کار ——— ہوشیار!
میں نہیں کہتا تبر و دشنہ و خنجر اُٹھا ——— سر اُٹھا
ہر بسر اُفتادہ کو آغوشِ محبت میں لے ——— دوڑ کے
جو ملے درماندہ اُسے ہاتھ بڑھا کر اُٹھا ——— سر اُٹھا

بیکس و بے چارہ و بے یار کا ہمدرد بن ——— مرد بن
خاک پہ سب جس کو گرا دیں اُسے سر پہ اُٹھا ——— سر اُٹھا
کچھ تجھے معلوم ہی کیا ہے سببِ اضطراب؟ ——— انقلاب!
اس سے کوئی فیضِ نگاہوں کو اُٹھا کر اٹھا ——— سر اٹھا
دیکھ اُفق سے وہ برسنے لگی تابندگی ——— زندگی!
فرصتِ پرواز ہے ٹوٹے ہوئے شہپر اُٹھا ——— سر اُٹھا
شورشِ طوفاں کے سمٹنے کا نہ کر انتظار ——— بار بار
پار بھنور سے تجھے ہونا ہے تو لنگر اُٹھا ——— سر اُٹھا
عظمتِ اقوامِ وطن تیری امانت میں ہی ——— پے بہ پے
بار یہ سر پر صفتِ مردِ قلندر اُٹھا ——— سر اٹھا
گفتۂ سیماب کی تعمیل بہر طور کر ——— غور کر
تیرے جگانے کو اُٹھانے کو یہ اکثر اُٹھا ——— سر اُٹھا

اے ہندوستاں!

تہذیبِ مستعار پہ اِترا رہا تھا تُو
اِک خارجی نشاط کے گُن گا رہا تھا تُو

تجھ کو تکلف اور تصنع سے کام تھا
لیل و نہار خوگرِ شُربِ مدام تھا

حد سے بڑھا ہوا تھا "غذا" و "لباس" میں
تھی سادگی نہ تیرے خیال و قیاس میں

وضعِ قدیم چھوڑ کے اربابِ خیر کی
تقلید کی مشاغلِ اقوامِ غیر کی

تیری معاشرت میں وہ اجزا تھے سب دخیل
دَورِ سلف نہ کُلیتاً جن کا تھا کفیل

بیکار کر چکی تھیں تن آسانیاں تجھے
گھیرے ہوئے کھڑی تھیں پریشانیاں تجھے

اور ــــ تیرا ماضی دیکھ رہا تھا ــــ،

فطرت نے جنگ کر کے مسلط جہان پر
تہذیبِ نَو کو بار کیا تیری جان پہ

اب عیش کی کمی سے ترا تنگ حال ہے
قحطِ تکلفات سے جینا وبال ہے

وضعِ قدیم تو اگر اپنی نہ چھوڑتا
یہ دَور تجھ پہ ایسی قیامت نہ توڑتا

پھر لوٹ اپنے ماضیٔ مسرور کی طرف
اسلافِ سادہ وضع کے دستور کی طرف

جو ہیں معاشرت میں اضافے وہ ترک کر
پھر سادگی سے عالمِ فانی میں کر گزر

خوئے "فضولیات و خرافات" چھوڑ دے
تقلیدِ عامیانہ کی زنجیر توڑ دے

جب منزلِ قدیم پہ اپنی تو آئے گا
حاصل سکون ہو گا تجھے، امن پائے گا

رجعت سے اب نہیں ہے کسی طرح بھی مفر
لے جا رہا ہے وقت تجھے خود ہی کھینچ کر

اور ــــ تیرا مستقبل مسکرا رہا ہے ــــ،

جاہل باش و خوش باش

ظاہر و باطن کی ہے تفریق علم و جہل میں
ایک تکمیلِ خرد ہے اک جنوں کی بے حدی

علم ظاہر عشق باطن، وہ زباں یہ عین دل
مکتبِ اسرار کا یہ منتہی وہ مبتدی

ظالم و جاہل کیا ہے تجھ کو پیدا فطرتاً
علم اور عرفان کا احساس ہے بے مقصدی

عشق سرتا پا فنا ہے، علم سیرِ ارفنا
عشق ادراکِ حقیقت، علم تمییزِ بدی

ہیں اضافے میں برابر درکِ ہستی کے لئے
ایک لمحہ عشق کا اور علم کی پوری صدی

معنوی تعلیم قلب و جسم کو دیتی ہے روح
ہے فقط اک رسمِ مہمل مرشدی و مرشدی

رات دن انسان کو دیتے ہیں درسِ کفر و جہل
یہ نظر افروز پردے ابیضی و اسودی

باخبر ہونا ہے گویا، بے خبر ہونا یہاں
امّی و الکن زباں ہیں ترجمانِ ایزدی

جن کو ہے عرفان اُن کی بند رہتی ہے زباں
خامشی ہے وجہِ تسکین و نشاطِ سرمدی

صورتِ منصور جو بولا وہ مارا جائے گا
پیرِ سندھی ہو کوئی یا ہو فقیرِ سرحدی

Iqbal Inst. of Islamic Studies (LIBRARY) New Delhi

خاموش!

وسعتِ صحرا میں کانٹوں کی زباں خاموش ہے
باغ میں پھولوں کی رنگیں داستاں خاموش ہے

چاند تارے اور سورج سب ہیں خاموشی بلب
ہے زمیں خاموش، پیرِ آسماں خاموش ہے

موج فانی، بحرِ باقی، راز اس کا آشکار
موج ہے پُر شور بحرِ بے کراں خاموش ہے

آشیاں سے باہر آ کر چہچہانا ہے عذاب
امن میں وہ ہے جو مثلِ آشیاں خاموش ہے

روح جس میں شورشیں ہیں زندگی کی ہے خموش
دل کہ ہے اک محشرِ آہ و فغاں، خاموش ہے

ہے بقدرِ ظرف تقسیمِ سکونِ کائنات
کوہسار و سبزہ زار و نے ستاں خاموش ہے
بزمِ کثرت کے یہ ہنگامے ہیں مطلق ظاہری
فی الحقیقت باطنِ کون و مکاں خاموش ہے
خامشی سے بھی ہوا کرتا ہے پیدا انقلاب
کاروبارِ محفلِ روحانیاں خاموش ہے
جس کو جتنی آگہی ہے، وہ ہے اتنا پُر سکوت
بے خبر چلّا رہا ہے، راز داں خاموش ہے
[1]ہے سکوتِ مستقل ہی دعوتِ امن و سلام
ہے نجات اُس کی مسلّم جو یہاں خاموش ہے
تو بھی خاموشی سے اس ہنگامۂ ہستی کو دیکھ
جس طرح فطرت کا سارا کارواں خاموش ہے

---

[1] من سکت فقد سلّم من سلّم فقد نجا

وقت کا مطالبہ

لیگ اور کانگریس سے

آج سازِ وقت کا ہر تار یوں ہے نغمہ زن
شرطِ آزادی ہے ربط و ضبطِ اقوامِ وطن
فیصلہ پیرِ فرنگی کا یہی برسوں سے ہے
متحد ہو کر جو کچھ مانگو، ملے گا من و عن
رات دن ہوتی ہیں آزادی کی مہمل کوششیں
اتحادِ ملک کا کرتا نہیں کوئی جتن
اتحادِ باہمی اس دور میں کیوں ہے محال؟
کیا اعادہ کر نہیں سکتیں روایاتِ کہن؟
قسمتِ اہلِ وطن میں پڑ گئی ہے جو گرہ
کھول سکتا ہے اُسے اک ناخنِ عقدہ شکن
ایک ہی پتھر سے ہے دَیر اور مسجد کی بنا
سب کا مقصد ایک ہے "تکبیر" ہو یا ہو بھجن"
مجھ سے سُن کیا ہے مذاہب کا اصولی اختلاف؟
پیکرِ انسانیت پر مختلف کچھ پیرہن
پیرہن اٹھ جائیں تو انسان صرف انسان ہے
کوئی ہندو ہے نہ مسلم ہے نہ سکھ یا ایرین
کیوں نہ ہندوستان کی قوموں کو ہم ہندی کہیں
قومیت کی کیوں نہ ہو تعئین من حیث الوطن

صرف ہندی ہو کے ہو سکتے ہیں ہم سب متحد
"اتحادِ قومیت" کی ہے یہ تدبیرِ حسن

حکمرانی ملک کی ملتی ہے اس تدبیر سے
ترک اس تدبیر کا ہے مطلقاً دیوانہ پن

پھر عمل پیرا نہیں کیوں ملک اس ترکیب پر؟
ذہنیت کیا اس کی ہے مفلوج؟ اے حاکم ذرا دیکھ

متحد کیوں ملک کی ہر قوم ہو جاتی نہیں؟
برخلافِ اختلافِ رہنمایانِ وطن

ایکہ بنیادت ضعیف و منتشر اجزائے نظم
پائے مستحکم کن و چنگل بہ تختِ تاج زن

اے زعیمانِ وطن، اے ذمہ دارانِ وطن!
صرف تھیٹر ہے تمہاری ہر سبھا ہر انجمن

کھیلتے ہو تم وطن کی زندگی سے رات دن
میں نے دیکھا ہے تمہاری ہر ادا کا بانکپن

ہیں فقط ہنگامہ گاہیں یہ تمہاری مجلسیں
کر رہے ہو شور و غوغا صورتِ زاغِ ذغن

دیکھتے ہو اپنے ایوانوں میں تم قلعوں کے خواب
ہے دماغوں پر تمہارے خواجگی پر تو فسون

اس لئے ہر خواب ابتک خوابِ بے تعبیر ہے
تم میں باقی ہی نہیں اب جرأتِ قلعہ شکن

مفلسوں میں رہ کے ہوتا ہے فلاکت کا علاج
تم امارت اور دولت پر رکھے بیٹھے ہو تھپن

پستیوں پر غور کرنے کی تمہیں فرصت کہاں
تم تو اپنی شخصیت کے ارتقا میں ہو مگن

ملک پر چھائی ہوئی ہیں لعنتیں افلاس کی
ہے نہ زندوں کیلئے روٹی نہ مُردوں کو کفن

بے سکونی چار جانب، چار سُو اک انتشار
ہر طرف جنگ و جدل ہے ہر طرف شور و فتن

دل تمہارے چھوٹے چھوٹے ہیں زبانیں ہیں دراز
خونِ حریت ہے ٹھنڈا۔ گرم اندازِ سخن

محوِ آزادی ہو وہ سمجھے جو اپنے کو غلام
اور تم خود کو سمجھتے ہو شہنشاہِ زمن

آڑے کر قوم و مذہب کی لڑے جاتے ہو تم
اور قوموں کو لڑاتے ہو بہ ذیلِ ماؤمن

اختلافِ عہدِ ماضی کی ہے لب پر داستاں
تم پرانے مدفنوں کے بن گئے ہو گورکن

آج ہے اک چیز مسلم اور ہندو ایک چیز
اختلافِ باہمی کی اللہ اللہ یہ بھین!

حشر تک اس طرح "آزادی" کا ملنا ہے محال
اور ان چالوں سے بڑھتا ہے غلامی کا چلن

دے چکے دھوکے وطن کے سادہ لوحوں کو بہت
تو مٹا ہوں میں تمہارا آج دامِ مکر و فن

صرف سدِ راہِ آزادی تمہارا ہے وجود
تم نہ ہو تو پھر نہیں منزل رہی کچھ بھی کٹھن

یا تو کر دو متحد اس ملک کے افراد کو
ساتھیوں کو ساتھ لے کر یا کرو ترکِ وطن!

یا بہ صلح و آشتی نظمِ چمن کن استوار
یا بہ تقدیرِ چمن بگزار تعمیرِ چمن

شکستِ جمود

ہر طرف اک جمود طاری ہے
واہ کیا زندگی ہماری ہے!

آشیاں تا قفس، ہیں سب خاموش
ہے زباں بند، سانس جاری ہے

ہے بظاہر سکون چہروں پر
روح میں رنگِ بے قراری ہے

قہرِ انسان پر ہے دانستہ
جبر ہے اور اختیاری ہے

نہیں فطرت کو فرصتِ تنقید
اِسے اپنا ہی کام بھاری ہے

وہی اُٹھتے ہیں جھوم کر بادل
وہی گلشن کی آبیاری ہے

وہی فصلِ چمن کی سالانہ
گل فروشی و لالہ کاری ہے

رعد کی ہے وہی جوان کڑک
وہی بجلی کی شعلہ باری ہے

وہی خورشید و ماہ کا ہے طلوع
وہی تاروں کی نقش نگاری ہے

وہی پھولوں کی ہے دل آویزی
وہی سبزے کی خوشگواری ہے

مگر انسان ہے خراب و تباہ
اس کی قسمت رہینِ خواری ہے

قوتیں جمع ہو گئی ہیں چند
جن پہ دنیا کی ذمہ داری ہے

اِن کے قابو میں ہیں ضعیف افراد
کوئی مفلس کوئی بھکاری ہے

شغل دن رات اِن غلاموں کا
جانکاہی اور جاں سپاری ہے

شہر ویراں ہوں، اور قصر آباد
یہی معراجِ شہریاری ہے

اے غلامو! جو تم میں ہمت ہو
اب بھی امکانِ رستگاری ہے

تا کجے یہ جمودِ بے معنے!
موت کیا زندگی سے پیاری ہے؟

کوششِ انقلابِ حال کرو
پھر یہ بزمِ جہاں تمہاری ہے

اپنی قوت پر اعتماد کرو
یہی تدبیر کارگاری ہے

توڑ ڈالو جمود کی زنجیر
کہ یہ زنجیر اعتباری ہے

موت انسان پر ہو کیوں طاری؟
خون جب تک رگوں میں جاری ہے

جولائی ۱۹۴۳ء

تم سے کچھ کہنا ہے اے اقوامِ شرق!

مشرق و مغرب میں جو تھا ایک ملکی امتیاز
مشترک تہذیب کا فتنہ ہے اس سے بے نیاز

ہے مسلّط عالمِ مشرق پہ مغرب کی فضا
ایک سے اطوار ہیں اور ایک سے انداز و ناز

ہو سکے محسوس جس سے مشرق و مغرب کا فرق
اب نہ وہ صبحِ بدخشاں ہے نہ وہ شامِ حجاز

مطلعِ خورشید پر آثارِ شب چھائے ہوئے
چہرۂ ناہید پر بکھری ہوئی زلفِ دراز

دفن سب خاکسترِ ماضی میں ہو کر رہ گئیں
وہ روایاتِ کہن، جن پر رہا مشرق کو ناز

جس قدر آثار ہیں قومی، سیاسی، مجلسی
ان میں خالص مشرقیت کا نہیں رنگ و طراز

داخلی اسباب ہیں جتنے وہ سب ہیں مستعار
ہے زوالِ مشرقِ اقصیٰ کا مضمر اس میں راز

وہ خصائص مشرقی قوموں میں جو مخصوص تھے
مسخ ہو کر رہ گئے ہیں سب بقدرِ حرص و آز

سر سے پا تک مغربی ہے آج مردِ مشرقی
اس کا آئینِ تمدّن اب ہے بیگانہ نواز

ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں دور تک تاریکیاں
یہ انھیں تاریکیوں میں کر رہا ہے ترک تاز

ڈھونڈتا ہے راستہ اپنا چراغِ غیر سے
بجھ گئی ہے وقت کی آندھی سے شمعِ خانہ ساز

وہ خلوصِ روح و مذہب ہی کہیں باقی نہیں
سب ہیں رسمی آرتھی دربار، پوجا اور نماز

درسِ "گو تم" ہے نہ اب تعلیم ہے "زرتشت" کی
"کرشن بھگتی" ہے، نہ پیروکاریِ "شاہِ حجاز"

دیش کی دھن ایک مدت سے نہیں گوش آشنا
مختلف نغموں سے ہے گونجا ہوا مشرق کا ساز

فی الحقیقت ہو جو تسکینِ حقیقی کی تلاش
اہلِ مشرق کیوں رہیں سرگشتۂ حسنِ مجاز

اپنی سیرت میں وطن کا رنگ و بو پیدا کرو
فطرتِ اقوام ہوتی ہے اسی سے سرفراز

رُخ بدل دو اپنے میلانات و احساسات کا
اور قلبِ ماہیت سے ہو جو تم کو احتراز

آج سے تم مشرقی اپنے کو کہنا چھوڑ دو
جاؤ مغرب میں بسو، مشرق میں رہنا چھوڑ دو

نئی ہوائیں

بے فصل اُٹھ رہی ہیں ظلمت فزا گھٹائیں　　دنیا پہ چھا رہی ہیں صبر آزما بلائیں
کانوں میں آ رہی ہیں کچھ دور سے صدائیں　　یہ گونجتی گرجتی شور آفریں فضائیں
تو سُن سکے تو اپنے نغمے تجھے سُنائیں

ویران ہو چلی ہے یہ جلوہ گاہِ عالم　　بڑھتا ہی جا رہا ہے حالِ تباہِ عالم
ہے باعثِ ہلاکت ہر رسم و راہِ عالم　　پھر اہلِ کیف دیکھیں کس لِ نگاہِ عالم
اپنی نظر کو پہلے میری نظر بنائیں

ہستی کی جلوہ گاہیں معمورِ شور و شر ہیں　　تعمیر کے پجاری تخریب در نظر ہیں
انسانیت کہاں ہے، انسان اب کدھر ہیں؟　　انسانیت کے زعمِ باطل کی پردہ در ہیں
انسان کے لہو میں ڈوبی ہوئی ہوائیں

پردے میں آشیاں کے تعمیر تھی قفس کی　　آخر رہی نہ مخفی ترکیب خار و خس کی

ظاہر ہے نقصِ نیّت رفتار سے نفس کی　　اب کیا چھپا سکیں گی عریانیاں ہوس کی
کاندھوں سے پنڈلیوں تک لٹکی ہوئی قبائیں!

بیچارگی کو ظرفِ پرواز دے رہی ہیں　　مُردہ پروں کو روحِ شہباز دے رہی ہیں
نالوں کو خامشی کا انداز دے رہی ہیں　　فطرت کی قوتوں کو آواز دے رہی ہیں
سہمے ہوئے دلوں کی خاموش التجائیں

افراد غور فرما اپنے مآل پر ہیں　　آثار کی نگاہیں تغیرِ حال پر ہیں
ہیں جوش انتہا پر غصے کمال پر ہیں　　زور آزما اب اُن کے بابِ جلال پر ہیں
بپھری ہوئی جہانِ مظلوم کی دعائیں

عالم شکستگی کا پھولوں پہ چھا رہا ہے　　گلچینِ وقت ان سے کانٹے بنا رہا ہے
گلشن کا آسرا کیا، وہ خود ہی جا رہا ہے　　وقتِ وداعِ گلشن نزدیک آ رہا ہے
اب آشیاں اجاڑیں یا آشیاں بنائیں؟

بیم و غم و رجا میں کھوئی ہوئی ہے دُنیا　　اندیشۂ فنا میں ڈوبی ہوئی ہے دُنیا
ذہنی اک ابتلا میں اُلجھی ہوئی ہے دُنیا　　اب حسن و عشق کو بھی بھولی ہوئی ہے دُنیا
دلداریاں ہیں قصہ، افسانہ ہیں وفائیں

کیا صبح کی بہاریں، کیا شام کی بہاریں　　یہ عارضی بہاریں، ہیں نام کی بہاریں

یہ نام کی بہاریں کس کام کی بہاریں　　اُس وقت دیکھ دورِ ایام کی بہاریں
جب دل کے داغ ٹپکیں اور زخم مسکرائیں!

خوں ریزیاں یہاں تک موجود ہیں فضا میں　　آمیزشیں لہو کی ہیں موجۂ ہوا میں
رقصاں ہیں سرخ ذرّے کرنوں کے ارتقا میں　　سُرخی جھلک رہی ہے مہتاب کی ضیا میں
جیسے عروسِ نَو کو خونیں ردا اُڑھائیں

تکمیلِ نیستی ہے یہ اضطرابِ ہستی　　ہے آخری حدوں پر حالِ خرابِ ہستی
کل جنتِ نظر تھا حسن و شبابِ ہستی　　ہے عبرتِ تماشا آج انقلابِ ہستی
گویا بدل گئی ہیں فطرت کی سب ادائیں

فرمانِ انتقامِ حرص و ہوا ہے جاری　　اب کس کو ہے میسر فطرت کی غم گساری؟
اب اپنے کام میں ہے فطرت کی ژرف کاری　　بے کار آہ و زاری بے سُود اشک باری
یہ آگ وہ نہیں ہے چھینٹے جسے بجھائیں

اے ہمنشیں سخنور اے شاعرِ مکرّم!　　اے رنگ و چنگِ محفل اے نغمۂ مجسّم!
میری تری نوا میں ہے اختلافِ باہم　　میں درد خواہِ عالم تو اپنے غم کا محرم
دیکھیں وہ اب ہمیں پر اپنا کسے بنائیں؟

بے چین قلبِ شاعر تھا پیشتر نہ اتنا　　آشوبِ دہر کا تھا اس پر اثر نہ اتنا

اس کی نگاہ و دل کو مجروح کر نہ اتنا　　مجروح کر چمن کو یارب مگر نہ اتنا
قطرے لہو کے ٹپکیں جس شاخ کو جھکائیں!

یہ برہمیِ پیہم، یہ کاہشِ مسلسل　　ہے غارتِ خودی کی اک کوششِ مسلسل
لیکن نہیں ہے مہمل آویزشِ مسلسل　　سیماب اس لئے ہے یہ شورشِ مسلسل
بھولے ہوئے دلوں کو شاید وہ یاد آئیں!

گلبانگِ بہار

بزمِ عالم کو سجا دینے کا موسم آگیا
رنگِ ہستی کو نیا دینے کا موسم آگیا

گرمیٔ گلشن بڑھا دینے کا موسم آگیا
آتشِ گل کو ہوا دینے کا موسم آگیا

زندگی کے نَو بہ نَو رنگیں عناصر پھونک کر
خاک کو انساں بنا دینے کا موسم آگیا

چاندنی راتوں کا رنگ و نور ہے ظلمت شکن
شام سے شمعیں بڑھا دینے کا موسم آگیا

دیکھنے کو گرمیٔ آغوش کی گل سازیاں
سیج پر کلیاں بچھا دینے کا موسم آگیا

دلنوازی نوعروسانِ چمن کی دیکھ کر
ہر نظر کو دل بنا دینے کا موسم آگیا

عالمِ جذبات پر طاری نہ تاریکی رہے
داغِ دل کی لَو بڑھا دینے کا موسم آگیا

وسعتِ ہستی کا سوزِ تشنہ کامی بڑھ چلا
برق و باراں کو صلا دینے کا موسم آگیا

خاک کے ذرّوں کو دے کر آبروئے شست و شو
ظلمتوں کو جگمگا دینے کا موسم آگیا

دل ہو یا ہو روح، یا تخئیل یا ذہن و نظر
سب کو دیوانہ بنا دینے کا موسم آگیا

اک نفس سازِ طرب ہے اک نفس موجِ بہار
بات سن کر گنگنا دینے کا موسم آگیا

اب نہیں تو اور کب ہو گی نوازش عشق کی؟
حسن کو درسِ وفا دینے کا موسم آگیا

سونے والوں کو نسیمِ تازہ دم کی چھیڑ دے
صبح سے پہلے جگا دینے کا موسم آگیا

ڈالیاں پھولوں کی لے چلئے کنارِ جوئبار
آگ پانی میں لگا دینے کا موسم آگیا

بے محابا رقص کرنے کے زمانے آگئے
بے ارادہ مسکرا دینے کا موسم آگیا

اور سب کچھ ماسوائے قصۂ ابر و بہار
بھول جانے اور بھلا دینے کا موسم آگیا

کشتگانِ بربریت کی پریشاں خاک کو
رنگ و بو کا خوں بہا دینے کا موسم آگیا

خوگرانِ کشت و خوں کو حامیانِ مرگ کو
زندگی کے گُر سکھا دینے کا موسم آگیا

رزم کے شورش کدوں میں جنگ کے گھمسان میں
نغمۂ تسکیں سُنا دینے کا موسم آگیا

اُن وجودوں کو جو ہیں بارِ نگاہِ کائنات
لوحِ ہستی سے مٹا دینے کا موسم آگیا

رنگ کے طوفاں بساطِ خاک سے اٹھنے لگے
جنگ کے شعلے بجھا دینے کا موسم آگیا

الغرض سیمابؔ فطرت کے جمالِ پاک سے
مادّی پردے اُٹھا دینے کا موسم آگیا

اے حجرہ نشینو!

شکن ڈالے پڑے ہو خاک آلودہ جبینوں میں
چھپائے دست و بازو لمبی لمبی آستینوں میں
یبوست کا تسلّط ہے دماغ زہد پرور پر
تناسب ہو قیاسوں میں، نہ گہرائی قرینوں میں
وہی وقتی تضرّع ہے وہی رسمی جبیں سائی
غلامی اینڈتی پھرتی ہو مسجد کے مکینوں میں
سمجھتے ہو تمہارا دل نہیں عرشِ الٰہی ہے
خدا کو بند کر رکھا ہے تم نے اپنے سینوں میں
ابوجہلو! تمہیں عرفاں نہیں اس راز کا شاید
خدا اب جلوہ فرما ہے بموں اور گن مشینوں میں

کشاکش ہائے نظمِ عالمِ امکاں میں ملتا ہے
وہ حجروں میں نہیں اب جنگ کے میداں میں ملتا ہے
نہیں ہے امتدادِ وقت کا تم کو یقیں اب تک
کہ تم ہو دورِ ماضی کی طرح بازِ زمیں اب تک
ہوئی مدت کہ تم نے سلب کر لی روحِ ملّت کی
رہے میت فروشِ مذہب و ایمان و دیں اب تک
نماز و سجدہ تک محدود ہے استعداد و ہمت ہے
وضو میں صرف چڑھتی ہے تمہاری آستیں اب تک
روایاتِ کہن کا درس اب بھی دے رہے ہو تم
خبر کچھ انقلابِ بزمِ ہستی کی نہیں اب تک
قیامت ساحلِ مشرق سے ٹکراتی ہے سر اپنا
مگر اے بزدلو، تم ہو یہاں حجرہ نشیں اب تک
تمہارا خانوادہ قوم کا اک جزوِ مہمل ہے
جو ہے اسلام کا داعی وہی طبقہ معطّل ہے
سبق تیرہ صدی پہلے کے اب تک ہیں زبانوں پر

کیا کرتے ہو تم لفظوں سے جادو نوجوانوں پر
حوادث سے زمیں کا گوشہ گوشہ شعلہ بر سر ہے
دماغ اب تک تمہارے ناچتے ہیں آسمانوں پر
نوائے ارتقا، ایسی اذانِ بزمِ ہستی ہے
کہ سنتے ہی جسے تم ہاتھ رکھ لیتے ہو کانوں پر
خدا اُن کے بنے بیٹھے ہو تم زعمِ تقدس میں
پڑے رہتے ہیں جو جاہل تمہارے آستانوں پر
عصا و جُبّہ و عمامہ، اسبابِ نمائش ہیں
مقدس جال ہیں یہ لمبے لمبے بال شانوں پر
شکاری قوم کے ہو، تاجرِ علم و عقیدت ہو
حقیقت میں تمہیں وجہِ زوالِ اہلِ ملّت ہو
چھپے بیٹھے ہوئے ہو تم قدامت کے نقابوں میں
مسلسل عورتوں کی طرح رہتے ہو حجابوں میں
اٹھو اور دو ثبوت اس وقت اپنے مرد ہونے کا
کہ تم ہو مجلسِ اہلِ وطن کے باریابوں میں

تحفظ میں وطن کے ساتھ اربابِ وطن کا دو
وطن ہے مبتلا اس وقت صد گونہ عذابوں میں
سوادِ ہند کے چاروں طرف بارود پھیلی ہے
نہیں معلوم کس دن آگ لگ جائے شتابوں میں
یہ حُجرے ہی تمہارے مستقل مدفن نہ ہو جائیں
کہیں تم دب کے رہ جاؤ نہ بوسیدہ کتابوں میں
ہے عہدِ جنگ ذہنیت بدل کر باہر آ جاؤ
جو زندہ ہو تو حجروں سے نکل کر باہر آ جاؤ

نوروزِ مشترک

سالِ ہجری و عیسوی کی ہم آغازی

اب کے باہم نعمتِ "نوروز" کی تحدیث ہے
صرف سہ روزہ تفاوت مظہرِ تثلیث ہے

ہے مگر رجحان میں دو ملتوں کے انتشار
عید ہے صبحِ کلیسا میں "حرم" ہے سوگوار

اک طرف افکارِ رنگیں میں امنگ آئی ہوئی
اک طرف تخئیل پر خونیں گھٹا چھائی ہوئی

سرخوشی و ساقی و نغمہ فشانی اک طرف
ماتم و تشنہ لبی و نوحہ خوانی اک طرف

مست آنکھوں میں سرورِ بادۂ رنگیں اُدھر
اور اِدھر مظلومیت کا خونِ تکلیفِ نظر

دو نئے سالوں کا یکجا جلوۂ آغاز دیکھ
اور پھر دونوں میں یہ تفریقِ سوز و ساز دیکھ

ہیں نمودار آج دو صبحیں افق پر پاس پاس
ایک کے لب پر تبسم۔ ایک کا جلوہ اداس

دو بہاریں آئی ہیں باغِ جہاں میں ساتھ ساتھ
پھول اس کے ہاتھ میں اُس کا گریبانوں پہ ہاتھ

"جنوری" کا آفتاب، افسانۂ نوروز ہے
چاند آغازِ "محرم" کا پیامِ سوز ہے

اپنی نظریں جذب کر کے صبح کے انوار میں
حدِ ممکن تک رسا ہونے دے انساں زار میں

دورِ حاضر کی تجھے ہر صبح آئے گی نظر
خاک بر سر، شعلہ در دل، خونِ تازہ تا کمر

یہ تصرّف ہے "محرم" کا جو عالمگیر ہے
کائنات اسلام کے "نوروز" کی تصویر ہے

چار سو پھیلے ہوئے ہیں واقعاتِ کربلا
یعنی ہے انسان کا ہاتھ اور انساں کا گلا

آج اک انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے
خون میں "تہذیب" کیا "انسانیت" بھی غرق ہے

"جنوری" کی صبح اک نوروز لائی بھی تو کیا
لے کر اک وقتی پیامِ عیش آئی بھی تو کیا

شام سے ہے پھر وہی صبحِ قیامت کا طلوع
دفعتاً ہو روشنی میں جیسے تاریکی شروع

عشرتِ یک لمحہ کیا جب ہو مصیبت دائمی
ہے تنگفت زندگی گویا شکستِ زندگی

بے سکونی ہیشتر ہے، عافیت کم ہے یہاں
سال بھر اب تو محرّم ہی محرّم ہے یہاں

کاش یہ انسان اپنی قوتوں سے کام لے
اپنے ہاتھوں میں نظامِ گردشِ ایام لے

کاش ہمت اس میں ہو تجدید اور ترمیم کی
فکرِ تازہ سے بدل دے کہنگی تقویم کی

منضبط "انسانیت" کا اک نیا آئین ہو
ہو سکوں آغاز میں، انجام میں تسکین ہو

ختم ہوں جھگڑے یہ سب تخریب اور تعمیر کے
ہو حقیقت رُونما باطل کا سینہ چیر کے

زندگی کی روح سے انسان کیف اندوز ہو
کاش اس دنیا میں ایسا بھی کوئی نوروز ہو

۲۸ دسمبر ۱۹۴۳ء

اے گوشہ نشیں اُٹھ!

کون کہتا ہے فضائے لامکاں کی سیر کر
تو جہاں پیدا ہوا ہے اُس جہاں کی سیر کر

تیری ہی دنیا کے حصے ہیں زمین و آسماں
حدِ ممکن تک زمین و آسماں کی سیر کر

تیرے طیّارے خلاؤں میں خراماں ہیں تو کیا
اور اُوپر جا۔ جہانِ کہکشاں کی سیر کر

ہیں زمیں کی وسعتیں بھی تیرے قدموں کیلئے
مشرق و مغرب کے ہر جلوہ ستاں کی سیر کر

روند ڈال اپنے قدم سے کیا جنوب اور کیا شمال
ہر طرف، ہر سمت، ہر جانب یہاں کی سیر کر

دیکھ سطحِ آب پر سیلاب و طوفاں کا اُٹھان
تہہ میں جا کر باطنِ آبِ رواں کی سیر کر

عالمِ ہستی کے طے کر سب نشیب اور سب فراز
وادی و کہسار و دشت و گلستاں کی سیر کر

دیکھ راہی ہیں رہِ ہستی میں کتنے قافلے
رہ گزارِ کارواں در کارواں کی سیر کر

ہیں سزاوارِ تماشا سیرگاہیں عشق کی
نجد و طور و بیستوں و مے کدہ خواں کی سیر کر

قصر و ایواں کی طرح زنداں بھی ہیں شایانِ دید
ہر قفس کی سیر کر ہر آشیاں کی سیر کر

کائناتِ دلکشِ دیر و کلیسا سے گزر
باقیاتِ عظمتِ اسلامیاں کی سیر کر

ہے یہ دنیا بہرِ انساں اک متاعِ بیکراں
حوصلوں سے اس متاعِ بیکراں کی سیر کر

خلد اک رنگیں تصور ہے مجسّم ہو نہ ہو
زندگی میں اس بہشتِ جاوداں کی سیر کر

خاک کے پُتلے تجھے آنا نہیں ہے پھر یہاں
سیر ہو کر جلوہ زارِ خاکداں کی سیر کر

جستہ جستہ تجھ پہ کھل جائیں گے اسرارِ حیات
صفحہ صفحہ میرے افکارِ جواں کی سیر کر

(۲۶ جنوری ۱۹۴۴ء)

کلکتہ

اے عروسِ صوبۂ بنگال۔ اے سحرِ تمام
غازۂ روئے سحر۔ آرائشِ گیسوئے شام

مرکزِ فن و تجارت، مشرقِ حسن و جمال
مخزنِ جاہ و امارت، مصدرِ علم و کمال

ساحلِ ہندوستاں گہوارۂ امن و اماں
جلوہ گاہِ صبحِ رنگیں، سجدہ گاہِ ہندیاں

ایک مدت سے پریشاں دیکھتا ہوں میں تجھے
شعلۂ و شبنم بداماں دیکھتا ہوں میں تجھے

ہے کبھی آتش فشانی سے فضا تیری حزیں
تیرے آنسو ہیں کبھی "ہگلی" میں طوفاں آفریں

بھوک اور فاقوں سے پاتا ہوں تجھے اکثر نڈھال
کثرتِ امراض سے بگڑا ہوا ہے تیرا حال

تیری فطری رونقوں میں پھر بھی بیداری سی ہے
گو فسوں کاری نہیں لیکن فسوں کاری سی ہے

تیرے بازاروں میں اب بھی ناچتی ہے زندگی
سبزہ زاروں پر ترے کھلتی ہے اب بھی چاندنی

اب بھی ساحل پر ترے کچھ مضمحل رعنائیاں
صبح سے پہلے لیا کرتی ہیں انگڑائیاں

اب بھی کالی کے پجاری نشۂ درشن بکف
رات دن گاتے ہیں نغماتِ عقیدت صف بصف

قصر و ایوانِ بلند اور آسماں رفعت مکاں
اب بھی تیری عظمتِ ماضی کے ہیں افسانہ خواں

کاروانِ مغرب کا جب اُترا تھا ساحل پر ترے
تو نے ہندوستان کے کھولے تھے اُس پر راستے

یاد ہے تاریخ کو ایثار فرمائی تری
آج کیوں بیکار ہے، پھر کارفرمائی تری؟

چاہیے دورِ گذشتہ کا کوئی ردِ عمل
کیوں تری دنیائے کیف و رنگ میں آئے خلل

اک نئی، لمبی، گرجتی، گونجتی انگڑائی لے
ہوں رجز کے ساتھ جس کے انقلابی پینترے

بند کر دے بدسگالانِ وطن کے راستے
لوٹ لے غارتگرانِ رنگ و بو کے حوصلے

ڈال دے رنگینیٔ ماحول پر جادو کے جال
پھونک دے سب ولولے کر دے عزائم پائمال

خلدزارِ ہند کا مشرق میں تو ہے پاسباں
بار پا جائے نہ کوئی دشمنِ امن و اماں

سلسلہ افراد کا مربوط ہونا چاہیے
تیرا ہر اک مورچہ مضبوط ہونا چاہیے

دُور تر ساحل سے تیرے ڈوب جائے آفتاب
آبِ ہگلی میں نہا کر آئے صبحِ انقلاب

۳ مارچ ۱۹۴۴ء

شاعر اور جنگ

اَلَا یَا اَیُّھَا الشَّاعِرُ! اسیرِ حسنِ ظن ہے تو
ہو کوئی حال لیکن اپنی ہی دُھن میں مگن ہو تو

سماعت سوز طیاروں کی ہیں پُر ہول آوازیں
مگر اک لحنِ دل آرا سے سرگرمِ سخن ہو تو

سخن کی محفلیں جاگی ہوئی ہیں تیرے نغموں سے
بدستور اپنے اندازِ کہن میں نغمہ زن ہو تو

تجھے شاید نہیں معلوم اپنا معنوی منصب
کہ شاعر ہی نہیں پیغمبرِ دورِ فتن ہو تو

خیالوں کے ذریعے رہنمائی کام ہے تیرا
قلم کے واسطوں سے قائدِ اہلِ وطن ہو تو

تری "رنگین غزلیں" قوم کے کیا کام آئیں گی؟
یہی ہے رنگ اگر تیرا، تو ننگِ علم و فن ہو تو

تری یہ شاعری تہذیبِ باطن کر نہیں سکتی
نہیں اہلِ سخن، اہلِ سخن کا پیرہن ہو تو

صدا جس کی ضمیرِ قوم میں جھولے، وہ شاعر ہے
جو کانوں میں اُتر کر روح کو چھو لے، وہ شاعر ہے

یہ جلسے شعر کے، یہ رات بھر نغمہ سرا ہونا
یہ ہر اک شعر پر پیہم صدائے "مرحبا" ہونا

"تغزل" میں یہ جنسیات کے جذبوں کی عریانی
یہ رازِ خلوت و ناموس کا عقدہ کشا ہونا

"رباعی" میں برنگِ فلسفہ تذلیلِ مذہب کی
بصد آزادیٔ تخئیل، بیزارِ خدا ہونا

ذرا کر غور، کیا یہ وقت ہے تخریب کاری کا
ذرا یہ سوچ، کیا انجام ہے اس کام کا ہونا

یہ دورِ انقلاب اور یہ تری وارفتہ سامانی!
تجھے تو چاہیے اس دورِ نو کا ناخدا ہونا

تُو شاعر ہے، تری آواز ہے پیغامِ مستقبل
تجھے زیبا نہیں ہے سدِ راہِ ارتقا ہونا

جو قدرِ وقت جانے تُو، جو میری بات مانے تُو
تو اب بھی عین ممکن ہے بھلا کرنا، بھلا ہونا

وہی اشعار پڑھ، جن سے فضا تیار ہو جائے
وہی نغمہ سُنا، جس سے وطن بیدار ہو جائے

(۷ اپریل ۱۹۴۴ء)

صبحِ بنارس

طلوعِ آفتابِ صبح ہے گنگا کے ساحل سے
حسیں جس طرح کوئی جھانکتا ہو چاکِ محمل سے

ہوائیں غسل کرنے آرہی ہیں رودِ گنگا میں
جو نزہت ہو لبِ دریا وہی نزہت ہو صحرا میں

سرِ ساحل شباب و شیب سب اشنان کرتے ہیں
خدا سے لَو لگاتے ہیں، خدا کا دھیان کرتے ہیں

نظر کش سطوتِ تعمیر سے ہے مغربی ساحل
فلک گویا ہے سطحِ مرتفع سے ایک ہی منزل

کنارِ آب کچھ سادھو ہیں، پنڈت ہیں پجاری ہیں
بہت سی کشتیاں دریا میں بہرِ سیر جاری ہیں

فضا پہلے سنہری پھر روپہلی رنگ دیتی ہے
کنارے پر غرض اک زندگی انگڑائی لیتی ہے

مگر مشرق میں جب ہوتا ہے یہ نور و ضو کا عالم
نظر آتا ہے مغرب کی طرف اک سوز کا عالم

سرِ ساحل ہی اک مرگھٹ بھی ہے بے پردہ و عریاں
چتائیں جل رہی ہیں، ہو رہا ہے موت کا ساماں

ہیں کچھ لاشیں زمیں پر اور کچھ جلتی چتاؤں پر
مسلسل جن کے شعلے رقص کرتے ہیں فضاؤں پر

اُدھر تو زندگی کا صبحِ نو پیغام لاتی ہے
اِدھر شامِ فنا یہ موت کا منظر دکھاتی ہے

یہ تکلیفِ نظر، آغاز میں انجام کا عالم!
تحیر خیز یکجا صبح کا اور شام کا عالم

چٹختی ہڈیوں، جلتے ہوئے جسموں کی بدبو سی
پگھلتی چمڑیوں، جھلسی ہوئی لاشوں کی بدبو سی

چراند اڑتی ہوا در مسموم کرتی ہو فضاؤں کو
بالآخر گرم کر دیتی ہے دریا کی ہواؤں کو

یہ منظر باوجودِ سعی بھولا بھی نہیں جاتا
نہیں ہٹتی نظر بھی اور دیکھا بھی نہیں جاتا

میں اُن سے پوچھتا ہوں جو ہیں ذمہ دارِ صحت کے
لبِ دریا ہی کیوں ہوں مینا نظر یاس و حسرت کے؟

سحر کی گود میں کیوں شام عبرتناک ہو جائے؟
جواں نظروں کے آگے کیوں جوانی خاک ہو جائے؟

خراب اس طرح کیوں صحت ہو سیاحانِ ساحل کی؟
ہو کیوں شعلہ بداماں تازگی رومانِ ساحل کی؟

کنارِ رودِ گنگا کیوں یہ مُردے لائے جاتے ہیں؟
سرِ کوثر کہیں آتش کدے سلگائے جاتے ہیں؟

نظر سے دور مرگھٹ کیوں نہ ہو تعمیرِ صحرا میں؟
وہاں سے راکھ لا کر کیوں نہ ڈالی جائے دریا میں؟

اگر ممکن نہیں اس رسم سے پہلو تہی ہونا
تو ہے دو چار ساعت بہتر اس کا ملتوی ہونا

سحر جب ساز رنگیں چھیڑ کر اپنا چلی جائے
تو پھر اس سوزِ غم افروز کو آواز دی جائے

ابھی اس کو مٹا دیتا، اگر ہوتا مرے بس میں
یہ داغِ آتشیں ہے دامنِ صبحِ بنارس میں

(۱۸ مئی ۱۹۴۴ء)

ایثار

اک ضعیفہ، موت کے بستر پہ ہے زار و نزار
ہر نفس کے ساتھ پر ہے اجل کا انتظار

پائینتی بیٹھا ہوا ہے اُس کا فرزندِ جواں
ماں کی بیماری سے جس کا دل ہے خونبا فشاں

یاس کی تاریکیاں ہیں ہر طرف چھائی ہوئی
شمع کی لَو تک اداسی سے ہے سنولائی ہوئی

گھر پہ طاری ہیں ابھی سے قبر کی ویرانیاں
ایک ہیبت ناک سناٹا ہے، اور ہُو کا مکاں!

ناگہاں باہر سے شور و غل کی آتی ہے صدا
کھول کر آنکھیں ضعیفہ پوچھتی ہے "کیا ہوا"؟

ہے یہ کیسا شور بیٹا۔ ہے یہ کیسی برہمی
کیا مرے مرنے سے پہلے ہی قیامت آگئی؟

نوجواں فرزند کہتا ہے کہ اماں دفعتاً
ہو گئی یورش وطن پر دشمنوں کی غالباً

ہیں کچھ افرادِ وطن آمادۂ جنگِ وطن
سازِ ارباب وطن کا ہے ہم آہنگِ وطن

ماں یہ سنتے ہی تڑپ جاتی ہے فرطِ درد سے
گرم ہو جاتا ہے ماحول اُس کی آہِ سرد سے

کہتی ہے گھبرا کے۔ جائے رونق و رنگِ وطن
ہے تجھے بھی تو ضروری شرکتِ جنگِ وطن

تجھ پہ، مجھ سے بھی زیادہ ہیں فرائض ملک کے
وقت آپہونچا ادائے فرض کا تیرے لئے

زندہ رہ کر میں ابھی تیرا کروں گی انتظار
تو سُنے گا جنگ کے میدان میں میری پکار

دیدۂ فرزند سے حسرت کے آنسو ہیں رواں
سر بطورِ انکار کے ہلتا ہے ساکت ہے زباں

ہے اِدھر انکارِ پیہم اور اُدھر اصرار ہے
"مامتا" اور "فرض" میں نازک سہی اک پیکار ہے

ماں نے آخر جب قسم دی اُس کو اپنی جان کی
فرض اس پر ہو گئی تعمیل ہر فرمان کی

ماں کی جانب دیکھتا وہ تار و نا ہو گیا
ماں نے آنکھیں بند کیں، ہونٹوں پہ تھرّائی دعا

"ہمت" اور "احسان" کا کردار کہتے ہیں اِسے
اصطلاحِ "خُلق" میں "ایثار" کہتے ہیں اِسے

جنگ کے میدان میں ہے بارشِ خون و شرار
دَورِ صہبائے شہادت چل رہا ہے بار بار

نوجوانانِ وطن، ہمت ور و آزاد خو
خاک اور خوں میں نہا کر ہو رہے ہیں سرخرو

سرخیٔ سیمائے آزادی ہیں دھارے خون کے
آتشِ شہرِ غلامی ہیں شرارے خون کے

ذرہ ذرہ خوں چکاں ہے جنگ کے میدان کا
آزمایا جا رہا ہے حوصلہ انسان کا

اک جواں کھاتا ہے سینے پر اَنی تلوار کی
خاک پر گرتے ہی بڑھ جاتی ہے اس کی تشنگی

چاہتا ہے وہ کہ چھاگل سے بجھائے اپنی پیاس
دفعتاً اور اک جواں گرتا ہے آکر اُس کے پاس

پیاس سے لب خشک ہیں آواز صدمے سے حزیں
وائے محرومی، کمر میں اُس کی چھاگل بھی نہیں

رینگتا ہے دیکھ کر اُس کو وہ پہلا نوجواں
جسم میں اس کے ہو لرزش خوں سینے سے رواں

کچھ نہیں رہتا اسے احساس اپنی پیاس کا
اُس کے ہونٹوں سے لگا دیتا ہو جو اگل کا سرا

ہوتے ہی سیراب آجاتی ہو اس میں جان سی
اور اس کو ختم کر دیتی ہے شدّۃ پیاس کی

ٹوٹنے کو سلسلہ ہوتا ہے روح و جسم کا
ناگہاں کانوں میں اس کے ناں کی آتی ہو صدا

مرکے اوروں کو جلا لینا، بہت دشوار ہے
یہ مسیحائی ہے، یہ بے مثل اک "ایثار" ہے

(۸ اکتوبر ۱۹۴۳ء)

اُجالا بندی[۵۱]

فطرت کی روشنی میں

کل حکم اندھیرا کرنے کا آغازِ شب میں آیا تھا
تعمیل میں اسکی ہر جانب گھنگھور اندھیرا چھایا تھا

مہتابی سے دیکھا میں نے تا دُور سماں تاریکی کا
چھایا ہوا سارے شہر پہ تھا گھر اسا دھواں تاریکی کا

نظروں میں مری آغازِ تخلیقِ عالم کا منظر تھا
جب ذکرِ چراغ و شمع نہ تھا جب آئینہ بے جوہر تھا

وہ حالت تھی جیسے کہ تمدن دنیا میں آیا ہی نہیں
ذہن اور شعورِ انساں کو قدرت نے چمکایا ہی نہیں

روشن تھیں گھروں میں کچھ شمعیں مستورِ حجابِ تاریکی
جیسے انسانِ اوّل کی آنکھوں پہ نقابِ تاریکی

ایوانوں کو ہیبت آگیں تاریکی نے یوں گھیرا تھا
اندر کمزور اُجالا تھا اور باہر سخت اندھیرا تھا

مہتاب تجلی ریز ہوا ناگاہ اُفق کے کونے سے
جس طرح اندھیرے میں پھوٹیں رنگین شعاعیں سونے کی

BLACK OUT ۵۱

ہر سمت اُجالے پھیل گئے، ساری ظلمت کافور ہوئی
سمٹے رفتہ رفتہ سائے، بزمِ عالم پُر نور ہوئی

نزہت پھیلی ہر رخسارِ عنابی و سیمابی پر
ہونٹوں پہ تبسم کھل اُٹھا، جب چھوٹ پڑی مہتابی کی

مہتاب کی زرّیں کرنوں کو انسان کبھی سنولا نہ سکا
فطرت کے اس بجلی گھر پر قابو کوئی بھی پا نہ سکا

خلقت کے نوشتے گوناگوں قدرت کا مضموں ایک ہی ہے
دستور ہیں لاکھوں دنیا کے، فطرت کا قانون ایک ہی ہے

چاند اور سورج کی قندیلیں دن رات فروزاں رہتی ہیں
دنیا کی فضائیں دونوں سے ہر وقت درخشاں رہتی ہیں

انسان کمالِ حکمت سے مختار بنا ہے دنیا کا
ہستی کے عناصر پر اس کا ہر چند کہ ہے پورا قبضا

آگ اور ہوا پانی مٹی سب پر ہے حکومت حکمت کی
پھر بھی انساں کو لاحق ہے مجبوری محکومیت کی

انسان کی مصنوعی شمعیں جب راتوں کو بجھ جاتی ہیں
فطرت کی فطری روشنیاں اپنی کرنیں پھیلاتی ہیں

دنیا کے محافظ ہاتھ ہمارا گر نہ لگائیں دنیا میں
مختاریت کے دیوانے اندھیر مچا دیں دنیا میں

پابندِ نظامِ فطرت کا اعلانِ خودی معیوب ہی ہے
غالب کتنا ہی ہو جائے پھر بھی انساں مغلوب ہی ہے

کل چاند کی آزادی ہے، کرن عرفان کی دل میں پھوٹی ہے
مجبوری ہے اصلِ انساں اور مختاریت جھوٹی ہے

فطرت جب اپنی قوت کے انوار دوبالا کر دے گی
کیسا ہی اندھیرا ہو جائے، دنیا میں اجالا کر دے گی

۵ر جنوری ۱۹۴۲ء

دعوتِ تجدید

پرستارانِ علیؓ و عمرؓ کو —!

اے پرستارانِ عظمت، بندگانِ شخصیات
ہیں ادب کے ساتھ تم سے پوچھتا ہوں ایک بات

حافظِ افسانہ ہائے رفتہ ہو تم دہر میں
ہیں زباں پر ساڑھے تیرہ سو برس کے واقعات

کھیلتے ہو ماضیٔ مرحوم سے تم حال میں
کر دیا ہے موت کے آثار کو غفلت سے مات

ہے کسی سے دوستی تم کو کسی سے دشمنی
قابلِ نفرت ہے کوئی کوئی شایانِ صلوات

آج صدیوں بعد بھی وہ ہند میں موجود ہیں
عہدِ عثمانؓ و علیؓ میں جو ہوئے تھے حادثات

ہے مسلماں سے مسلماں بالارادہ دست و ریش
باہم آویزی وہی ہے بر بنائے حسیات

زیبِ اخبار و رسائل ہیں وہی عنوانِ سرخ
خانہ جنگی کی وہی طاری ہیں تم پر کیفیات

نثر کے مضموں میں ہے پیکارِ خشم و اشتعال
نغمۂ موزوں میں ہے انبارِ رطب و یابسات

کیا کبھی ان کے نتائج پر کیا ہے تم نے غور؟
کام جو سمجھے ہیں اب تک از قبیلِ واجبات

کیا یہ جذبے ہیں تمہارے قابلِ تعمیرِ قوم ؟
کیا یہ باتیں ہیں تمہاری ضامنِ امن و نجات؟

ہو فقط الفاظ کے بندے عمل کچھ بھی نہیں
یعنی تقلید و تاسّی ہے فقط کہنے کی بات

"پیروی" کا تم ابھی مفہوم سمجھے ہی نہیں
صرف ہیں محمودِ مدح و ذم تمہارے مدرکات

تم ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ کو ہنوز
یاد کرتے ہو زروئے اعتقاد و التفات

اُن کا کردار آج تک تم میں نہ پیدا ہو سکا
ان میں تھے لاکھوں محاسن تم اسیرِ سیئات

اُن کے رجحانات کا مرکز تھا قرآن و حدیث
ہیں تمہارے لب پہ الفاظِ کثیف و واہیات

رات دن تنظیمِ ملت اُن کا نصب العین تھا
اور تم لہو و لعب میں مبتلا دن ہو کہ رات

یاد ہیں وہ دن کہ جب تھا غلبۂ اصنام عام
جب حرم سب سے بڑا تھا ایشیا کا سومنات

جب خدا اک واہمہ تھا اور بت عین الیقیں
خود پرستی و خودی جب تھی مدارِ خواہشات

کفر کی تاریکیوں کو دور کرنے کے لئے
آئے لے کر مشعلِ وحدت رسولِ کائنات

کی گئی تبلیغ و ترسیل اس طرح اسلام کی
پانی پانی ہو گئی سنگینیٔ لات و منات

سعی میں چاروں صحابہؓ تھے برابر کے شریک
ہے مساوی ان کا درجہ فی الکمال و فی الصفات

اپنی جانیں کیں فدا اصحابؓ نے اسلام پر
یوں دیا دنیائے باطل کو نیا درسِ حیات

حضرتِ بوبکرؓ و فاروقؓ اور عثمانؓ و علیؓ
جانشینِ مصطفےٰؐ تھے عارفِ روحانیات

اِن سے جن لوگوں کو نسبت ہے مبارک ہیں وہ لوگ
صرف نسبت ہو نہیں سکتی، مگر وجہِ نجات

کوئی فاروقی و صدیقی ہے عثمانی کوئی
اور کوئی حیدری لیکن تعجب کی ہے بات

حیدرؓ و بوبکرؓ و عثمانؓ و عمرؓ کوئی نہیں
صرف نسبت رہ گئی باقی ہوئی مفقود ذات

آہ جس ملت میں اتنا سخت ہو قحط الرجال
جس میں چودہ سو برس تک بھی پیدا ہوں ثقات

کارواں ہو اور امیرِ کارواں کوئی نہ ہو
کس طرح آساں رہِ منزل کی پھر ہوں مشکلات

انقلابِ وقت دیتا ہے پیامِ اجتہاد
ہے اگر منظور اب بھی قوم و ملت کا ثبات

خود امیرِ کارواں بن جائیں اہلِ کارواں
صورتِ سیلاب چھا جائیں زگنگا تا فرات

قوم میں اسلاف کے کردار ہونے چاہئیں
کوئی عثمانؓ ہو کوئی حیدرؓ ہو مجدِ ممکنات

آدمی کو دی ہو خالق نے خلافت ارض کی
جامعِ مجد و شرافت آدمی ہی کی ہو ذات

آدمی میں ظرفِ اخلاقِ الٰہی بھی تو ہے
کسب کر سکتا نہیں کیا آدمیت کی صفات

پہلے تم بھی فاتحِ عالم تھے عزم و جزم سے
ہو اگر احساس پھر ممکن ہو فتحِ شش جہات

آدمی بھولا ہوا ہے اپنی فطری قوتیں
دوسروں کے آسرے پر ہے اسے زعمِ نجات

مرثیہ خوانی، قصیدہ گوئی، رسمی شاعری
ہو نہیں سکتی کفیلِ ارتقائے قومیات

ہے ضروری قوتِ خود اعتمادی و عمل
زندگی ممکن نہیں ہے بر سبیلِ ظنیات

اک حیاتِ نو کی پھر تمہید ہونی چاہئے
ہو چکی تقلید اب تجدید ہونی چاہئے

(۸ مارچ ۱۹۳۲ء)

دعوتِ جشنِ عید

عشرتِ عید کو شائستۂ تائید بنا　　ہاں منا عید منا
صبحِ نوروز کو ہم طالعِ خورشید بنا　　ہاں منا عید منا

ہیں جو گردش میں ستارے تو نہیں کچھ نقصان　　تو ہے خود خالقِ انوار، اگر ہو ایقان
حاصلِ سجدۂ و طاعات ہے تیرا ایمان　　کہنیوں، ٹخنوں میں ماتھے میں جو ہیں چند نشان
ان نشانوں سے نئے کوکبِ دنا ہید بنا

ہاں منا، عید منا

توڑ دے رسم پرستی کی ہر اک قید او ربند　　کہنگی اور قدامت کی غلامی تا چند!
دل صنم دوست ہے تیرا ہے خودی اس کو پسند　　روح کے ساز سے کر نعرۂ تکبیر بلند
اس صنم زار کو پھر کعبۂ توحید بنا

ہاں منا، عید منا

برق کی زد میں ہے گلشن، تو پریشان نہ ہو　　شرر آلود ہے دامن، تو پریشان نہ ہو
ہیں فضائیں شرر افگن، تو پریشان نہ ہو　　جل رہا ہے جو نشیمن، تو پریشان نہ ہو
شاخ پر شعلے کی گل خانۂ اُمید بنا

ہاں منا، عید منا

راہِ منزل نہیں آساں، تو پریشان نہ ہو　　ہے اگر خاک بداماں، تو پریشان نہ ہو
راہبر کا نہیں امکاں، تو پریشان نہ ہو　　راستے ہیں جو پریشاں، تو پریشان نہ ہو
خود کوئی راہ نئی قابلِ تقلید بنا

ہاں منا، عید منا

زنگ لگ جائے نہ سوکھے ہوئے پیمانے میں　　بھر اسے خون سے اقوام کے میخانے میں
گلستاں بننے کے آثار ہیں ویرانے میں　　انقلاب آنے کو ہے وقت کے افسانے میں
نئے عنوان، بہ پیرایۂ تجدید بنا

ہاں منا، عید منا

عید ہے شکریۂ نعمتِ حق ہے مقصود　　ہو نہ جائے کہیں یہ جذبۂ فطری مفقود
خوگرِ غم نہ ہو، جاوید نہیں غم کا وجود　　جو ازل سے تری ملت کے لئے ہے موعود
عید کو اُس ابدی عیش کی تمہید بنا

ہاں منا، عید منا

عید کے دن بھی غم اندوز ہی پاتا ہوں تجھے
عالمِ نَو کی طرف کھینچ کے لاتا ہوں تجھے

تیری قسمت میں مسرت ہی بتاتا ہوں تجھے
مژدۂ "لا تحزنوا" یاد دلاتا ہوں تجھے

شامِ غم کو بھی جوابِ سحرِ عید بنا
ہاں منا، عید منا

(۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ء)

نمازِ عید

اور محاسبۂ ضمیر

دخیلِ کعبۂ دل شورش و فتن تو نہیں؟
ترے خیال کی خلوت میں انجمن تو نہیں؟

تو عید گاہ میں آیا ہے کیا بطورِ رواج؟
اسیرِ رسم و روایت ترا چلن تو نہیں؟

تری نگاہ کی نازش نمازِ عید کے وقت
کلاہ و جُبّہ و دستار و پیرہن تو نہیں؟

یہ دیکھ لے ترے سر میں دمِ قعود و قیام
غرورِ طاعت و پندارِ ما و من تو نہیں؟

کرے جو سجدہ تو پہلے یہ غور بھی کر لے
جبینِ صاف پر اندیشہ شکن تو نہیں؟

ترا حریم حقیقت سے دُور تو نہیں سر؟
ترے سجود کا مرکز بتِ وطن تو نہیں؟

نشاطِ نفس کی تمہید تو نہیں ہے نماز؟
نظر میں شام و شبِ عید کی پھبن تو نہیں؟

براہِ راست جلالِ خدا سے قطعِ نظر
کسی حسیں کا تصور میں بانکپن تو نہیں؟

نمود کوششِ ریا تو نہیں ترا اظہر؟
ترا لبوں پر ستارِ اہرمن تو نہیں؟

زباں جو ذکرِ خدا میں ہے عادتاً مصروف
خرابِ ذائقہ و لذتِ دہن تو نہیں؟

حریمِ قدس میں طوفِ نگاہِ ول کے سوا
خیالِ سیر و سرِ جلوۂ چمن تو نہیں؟

جہاں ہے عظمت و خوفِ خدا ترے دل میں
وہیں محبتِ فرزند و دخت و زن تو نہیں؟

ضمیر و ذہن میں تیرے خدا کی یاد کے ساتھ
زیاد و ناز و مباہات و مکر و فن تو نہیں؟

یہ زینت اور تکلف یہ غیر معمولی!
رہینِ منتِ راہن ترا بدن تو نہیں؟

اُدھار تو نہیں لایا ہے چار جامۂ عید؟
ادائے قرض کی دل میں ترے گھٹن تو نہیں؟

جوانِ قلعہ شکن ہے۔ مگر کر اندازہ
کہ تیرے خون میں گرمی سہی، جلن تو نہیں؟

تو جس میں بھر کے "زکوٰۃِ حیات" لایا ہے
یہ زندہ لاشۂ مزدور کا کفن تو نہیں؟

اگر نہیں ہے۔ تو ہے ہدیۂ نیاز قبول
یقین کر، ہے تری عید کی نماز قبول

۱۵ ستمبر ۱۹۴۲ء

عیدِ امروز

عید اب کے آئی ہے کیسی مہیب و ہولناک
ہے نظر اندوہ سے خالی، نہ دل ہے غم سے پاک

بڑھتے بڑھتے غربت اپنی حد سے آگے بڑھ گئی
تھا گریباں چاک پہلے اور اب دامن ہے چاک

ہیں ہزاروں آج بیوائیں تو لاکھوں ہیں یتیم
کتنی مائیں ہو چکی ہیں نشترِ غم سے ہلاک

محو ہو کر رہ گیا ہے جذبۂ روحانیت
مادیت کا جہاں میں بڑھ گیا ہے انہماک

سینے سے ملتا ہے سینہ، دل سے دل ملتا نہیں
اب نہ وہ مہر و محبت ہے نہ وہ اُنس و تپاک

وہ مسلماں اب خدا کا نام تک لیتا نہیں
ہر طرف بیٹھی ہوئی تھی جس کی تکبیروں کی دھاک
ہیں صلوٰۃ و صوم سے عاری بچہ بچہ فیصدی
اور رسمِ عید میں نوّے فی صدی کا اشتراک
کیا یہی وہ عید ہے جو فرض تھی اسلام میں؟
کیا یہی اسلام ہے وہ نازشِ ارض و سماک؟
نفس کی آزادیاں ہیں روح کی بربادیاں
اب خدا کا خوف ہے دل میں، نہ قومیّت کا باک
لگ گیا انسانیت کو روگ جوعُ الارض کا
آج کل انسان ہی ہے جسمِ انساں کی خوراک
عالمِ فانی کے جھوٹے عیش سے دھوکا نہ کھا
اس کا خمیازہ تماشا کر میانِ خون و خاک

۱۶ اگست ۱۹۴۳ء

میں عید کیا مناؤں!

میرے وطن کی محفل اُجڑی ہوئی پڑی ہے
جمعیتِ احبا، بکھری ہوئی پڑی ہے
ساری فضائے باقی، سوئی ہوئی پڑی ہے
خوابوں کی اس فضا میں کیونکر الکھ جگاؤں؟
——— میں عید کیا مناؤں؟

تخریب کی گھٹائیں گھنگھور چھا رہی ہیں
سنکی ہوئی ہوائیں طوفاں اُٹھا رہی ہیں
ناخواستہ بلائیں دنیا پر آ رہی ہیں
ایسی ہماہمی میں کیا لطفِ عید اٹھاؤں؟
——— میں عید کیا مناؤں؟

لاکھوں مکاں ہیں ایسے جن کے مکیں نہیں ہیں
جو مرکزِ نظر تھے وہ اب کہیں نہیں ہیں

وہ ہمنوا نہیں ہیں وہ ہم نشیں نہیں ہیں
سازِ نشاط کے اب نغمے کسے سناؤں ؟
——— میں عید کیا مناؤں !

لوگوں کی خستہ حالی محسوس کر رہا ہوں
قوموں کی پائمالی محسوس کر رہا ہوں
جذبوں کی تنگ بالی محسوس کر رہا ہوں
احساس ہو نہ جس میں وہ دل کہاں سے لاؤں ؟
——— میں عید کیا مناؤں !

انساں کی خود پرستی محسوس کر رہا ہوں
ان خاکیوں کی مستی محسوس کر رہا ہوں
میں خود بھی اپنی پستی محسوس کر رہا ہوں
انساں ہوں تو ان کو انسانیت سکھاؤں
——— میں عید کیا مناؤں !

انسانیت جہاں میں پامال ہو رہی ہے
روحانیت بھی اپنے ماضی کو رو رہی ہے
سچی خوشی عدم کے جھولوں میں سو رہی ہے
جھوٹی خوشی منا کر کب تک فریب کھاؤں ؟
——— میں عید کیا مناؤں !

ہیں ظاہری تکلف، کپڑے نمائشی ہیں

اعمال ہیں ریائی، جذبے نمائشی ہیں
اس محشرِ ریا میں، کیا عید گاہ جاؤں ؟!
——— میں عید کیا مناؤں ؟

بے روح ہیں نمازیں، سجدے نمائشی ہیں
میرے چمن میں کتنی افسردہ مالنیں ہیں
میرے نگر میں کتنی کمسن بھکارنیں ہیں
دیکھوں انھیں کہ ان کو اپنی بپتا سناؤں ؟
——— میں عید کیا مناؤں !

میرے وطن میں کتنی بیوہ سہاگنیں ہیں
گلشن میں تازگی کا ہے اہتمام — لیکن
پھولوں میں ہے سکونِ دل کا نظام — لیکن
کلیاں شگفتگی کا، ہیں اک پیام — لیکن
دل رو رہا ہے میرا کس طرح مسکراؤں ؟
——— میں عید کیا مناؤں !

یہ چاند بھی پرانا، یہ صبح بھی پرانی
اک شمعِ شامِ ہستی، اک جامِ بزمِ فانی
لیکن مرا غمِ دل، شاید ہے جاودانی
جب غم ہے جاودانی، کیونکر اسے بھلاؤں ؟
——— میں عید کیا مناؤں !

۱۸ اگست ۱۹۴۲ء

اُفقِ بعید پر ایک طائرانہ نظر

جامعِ دہلی کے مشرقی مینار سے

(غروبِ آفتاب کے وقت)

فطرت کے ہیں کچھ نازک اشارے
یہ عبرت آگیں دُھندلے نظارے

یہ وقتِ آخر، یہ شامِ ہستی — آئینہ دارِ آلامِ ہستی
یہ ظلمت افزا پیغامِ ہستی — پردہ کشائے انجامِ ہستی
یہ لال قلعہ، یہ رودِ جمنا
یہ زندگی کے خاموش دھارے

——— فطرت کے ہیں کچھ نازک اشارے

ماضی کی عظمت دیکھے ہوئے ہیں — دنیا کی حالت دیکھے ہوئے ہیں
دستورِ فطرت دیکھے ہوئے ہیں — عیش و مصیبت دیکھے ہوئے ہیں
دیکھے ہوئے ہیں، نیرنگ ہستی
کچھ مہ پارے، کچھ ماہ پارے

——— یہ عبرت آگیں دُھندلے نظارے!

سڑکوں پہ چلنے والوں کی کثرت — ہے شام گویا، صبحِ قیامت
شور اور غوغا، بھوک اور فلاکت — یہ زندگی کی مفلوج صورت!
اشجار پر یہ طاری خموشی!
یہ طائروں کے ہر سو طرارے

——— فطرت کے ہیں کچھ نازک اشارے

یہ دائیں جانب، گورِ غریباں — خاموش جنگل سنسان میداں
تاریخ کے یہ آثارِ بے جاں — ہستی کے دفتر لیکن پریشاں
کچھ کچھ نمایاں، کچھ کچھ نہفتہ
جیسے گھٹائیں، مدھم ستارے

——— یہ عبرت آگیں دھندلے نظارے!

اور آگے بڑھ کر شبگوں فضائیں جیسے مسلسل کالی گھٹائیں
اور آگے بڑھ کر لاکھوں بلائیں اوڑھے ہوئے کچھ خونیں ردائیں
اور آگے بڑھ کر ــــ کالا سمندر
آباد و ویراں جس کے کنارے

ــــــــ یہ عبرت آگیں دھندلے نظارے!

وہ دُور افق پر چھائیاں سی جنگ و جدل کی انگڑائیاں سی
حرص و خودی کی خود رائیاں سی انسانیت کی رسوائیاں سی
اُڑتے ہوئے کچھ موجِ ہوا میں
تازہ لہو کے رنگیں شرارے

ــــــــ یہ عبرت آگیں دھندلے نظارے!

بپھرے ہوئے ہیں "خورشید زادے" نیت بُری ہے ناپاک ارادے
پہنے ہوئے ہیں خونی لبادے کچھ ہیں ہوائی، کچھ ہیں پیادے
اپنی خودی کی موجوں میں رقصاں
فسطائیت کے لیکر سہارے

ــــــــ یہ عبرت آگیں دھندلے نظارے!

سورج، جو اِن کا ذہنی خدا ہے خود مبتلائے رنجِ فنا ہے
مغرب میں اس کا مدفن بنا ہے اپنے لہو میں ڈوبا ہوا ہے
رنگِ شفق ہے اعلان اس کا
دیکھیں اگر یہ نخوت کے مارے

ــــــــ یہ عبرت آگیں دھندلے نظارے!

ہے چند روزہ یہ زندگانی یہ تاجداری، یہ حکمرانی
ہے ایک ذاتِ حق جاودانی اللہُ باقی مِنْ کلِّ فانی
ان سے بھی پہلے کچھ حکمراں تھے
وہ سب اجل سے جیتے کہ ہارے؟

ــــــــ فطرت کے ہیں کچھ نازک اشارے

کس نے کہا یہ۔ "اللہُ اکبر"؟ نظریں مری لوٹ آئیں سمٹکر
یہ کس کے آگے جھکنے لگے سر؟ یہ کس سے گونجے محراب و منبر
تو نے موذن کس کو پکارا؟
آثار کانپے، لرزے منارے

ــــــــ یہ عبرت آگیں دھندلے نظارے!

بے شک وہی ہے والی جہاں کا — مالک زمیں کا اور آسماں کا
مختارِ مطلق کون و مکاں کا — سلطان و عاکم ہر جسکراں کا

دنیا کے بھوکو! — پاگل حریصو!
دنیا نہیں ہے بس میں تمہارے
_____ فطرت کے ہیں کچھ نازک اشارے

(۱۶ر اگست ۱۹۴۳ء)

آویزۂ نیلوفری

گوشِ عالم کے لئے

۳۰ر اگست ۱۹۴۳ء کو حیدر آباد (دکن) کی ایک مجلس خواتین میں شہزادی نیلوفر نے فرمایا کہ "بھوک کے ماتھے پر مذہب اور ملت کا لیبل نہیں ہوتا" اسی ارشاد سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی گئی ہے۔

"بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملت کا"

شہزادی نیلوفر کے یہ دس موتی انمول بھی ہیں
تیکھے بھی ہیں، دلکش بھی ہیں، گراں بھی ہیں شمتول بھی ہیں
پیارے پیارے لفظ بھی ہیں اور میٹھے میٹھے بول بھی ہیں
موتیوں کی یہ ایک لڑی ہے، ایک خزانہ حکمت کا
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملت کا

بھوکا ہو انسان، تو پھر مسلم ہو یا زُنّاری ہو
پارسی ہو، سکھ ہو، عیسائی ہو یا گوتم دھاری ہو
ہندی ہو، افغانی ہو، چینی ہو یا تاتاری ہو
کوئی بھی ہو معتقد رہے ہر انسان سے میل محبت کا
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملّت کا

سندھی ہو، پنجابی ہو، آسامی ہو، بنگالی ہو
دکنی ہو، مدراسی ہو، گجراتی ہو، نیپالی ہو
بلوچستانی ہو، سنتھالی ہو یا گڑھوالی ہو
کہیں کا ہو، احساس ہی لازم اُس کے رنجِ فلاکت کا
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملّت کا

لنگڑے، لولے، کوڑھی، اندھے، آخر سب انسان ہی ہیں
گونگے، بہرے، کالے گورے، آخر سب انسان ہی ہیں
عورت، مرد، جواں اور بوڑھے، آخر سب انسان ہی ہیں
کیوں نہیں پھر انسان کے دل میں احساس اُن کی غربت کا؟
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملّت کا

ایک ہی تو ہے سب کا خالق، جو دنیا کا والی ہے
باغ میں پھول بھی ہیں کانٹے بھی ایک ہی سب کا مالی ہے
شخصیت کے دیوانوں نے پھوٹ یہ ساری ڈالی ہے
ورنہ بھوکا بھی ہے اک انسان انھیں کی قیمت کا
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملّت کا

یہ لاکھوں محتاج، جو غربت کے ہاتھوں نادار ہیں آج
یہ لاکھوں بیکار، جو ملک و قوم پر اپنی بار ہیں آج
پیٹ اِن کے بھر جائیں تو پھر جی اٹھنے کو تیار ہیں آج
ایک بڑا حصہ کیوں ہو مفلوج وطن کی وسعت کا؟
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملّت کا

دولت مندی اور غریبی کھیل ہیں دونوں قسمت کے
یہ دونوں باتیں نہیں قابو میں انسانی طاقت کے
بیکس اور محتاج کھلونے ہیں ایوانِ قدرت کے
کھیلنا ان کے حالِ شکستہ سے، اعلان ہے وحشت کا
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملّت کا

وہ چاہے تو کنکر پتھر مٹی کو بکھیراج کرے
وہ چاہے تو ایک گدا گر تخت پہ بیٹھے راج کرے
وہ چاہے تو تاجوروں کو دم بھر میں محتاج کرے
مجبوروں اور مسکینوں سے لوگ سبق لیں عبرت کا
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملت کا

چھوڑ یہ حیلے مذہب کے اور ملت کے نادان ہے تو
مذہب اور ملت کے مقصد سے اب تک انجان ہے تو
مذہب و ملت بعد کی چیزیں ہیں پہلے انسان ہے تو
دنیا میں رہ انساں بن کر۔ پاس کر اپنی عظمت کا
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملت کا

بھوکا جو کوئی مل جائے سب اس کی امداد کریں
دکھیوں کے اجڑے ہوئے دل جس طرح بنے آباد کریں
انسان جو کہلاتے ہیں وہ فرض کو اپنے یاد کریں
شہزادی کا یہ فرمانا درس ہے انسانیت کا
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملت کا

دولت والے بھوکوں کو جب اپنے گلے لگائیں گے
بھوکے تسکین کی دولت پاکر اُن کے گُن گائیں گے
اے سیماب وطن میں میرے ایسے دن کب آئیں گے؟
جوش میں کب آئے گا لہو اربابِ وطن کی غیرت کا؟
بھوک کے ماتھے پر نہیں ہوتا لیبل مذہب ملت کا

۶ ستمبر ۱۹۴۳ء

آج کی بیٹی اور کل کی ماں سے

کبھی سوچا ہے کیا تم نے ریاضِ ہند کی کلیو!
کہ بعد جنگ یہ ٹھٹھری ہوئی دنیا کہاں ہوگی؟

وہ ماں بھی، مامتا کے ساتھ اس پر غور فرمائے
جسے امید ہے "اک دن مری بچی جواں ہوگی"

بغیرِ علم ہوگی کس طرح تنظیم عالم کی؟
بغیرِ علم کیونکر کوششِ امن و اماں ہوگی؟

سمٹ کر ارتقا کی گود میں آجائے گی دنیا
وہاں پہونچے گی منزل کس طرح دنیا جہاں ہوگی؟

نہ ہوگا علم تو آگے بڑھیں گی لڑکیاں کیونکر؟
یقیناً ان کی ہستی بارِ دوشِ کارواں ہوگی

بغیرِ علم غرہ ہے جنھیں "حسن و جوانی" پر
انھیں آوارگی قسمت، نصیب دشمناں ہوگی

جوانی اور جہالت یعنی نشہ وہ بھی وحشی کا!!
یہ وحشت موت کا سامان اکدن بے گماں ہوگی

وہ علم اخلاق اور تہذیب جس کے دو نتیجے ہیں
میں اُس کی نہ کیا یہ دخترِ ہندوستاں ہوگی؟

جو بطنِ فاطمہؓ سے سینۂ ملت میں پہونچی ہے
خدانا خواستہ کیا وہ امانت رائیگاں ہوگی؟

جو روحِ رابعہؒ پنہاں ہے مستورات ملت میں
وہ (خاکم در دہن) کیا رہینِ کلفت زیاں ہوگی

اگر تعلیم اور تہذیب اُٹھ جائے گی دنیا سے
تو پھر اسلاف کی ناموس کس پر نوحہ خواں ہوگی؟

نہ پوچھی جائیں گی وہ عورتیں جن میں جہالت ہے
مگر ہاں علم اگر ہوگا تو دنیا قدر داں ہوگی

ملے گا علم واں شوہر نہ جس بے علم لڑکی کو
وہ فخرِ خاندان کیا ہوگی ننگِ خاندان ہوگی

ضرورت ہے بہر صورت جہالت کو مٹانیکی
جہالت باعثِ بربادیٔ اسلامیاں ہوگی

جو نسلِ حال ذوقِ علم سے رہ جائے گی تشنہ
تو پھر اولاد بھی اس کی ذلیل و ناتواں ہوگی

ہر اک لڑکی کرے محسوس ذمہ داریاں اپنی
کہ جو ہے آج بیٹی، عہدِ مستقبل کی ماں ہوگی

(۲ر دسمبر ۱۹۴۳ء)

بھوکا ہندوستان

آج زباں پر ہے دنیا کی "بھوکا ہندوستان" مرا
بھوک کے قصّے سنتے سنتے کانپ گیا ایمان مرا

بات یہ ہے ایمان کی ہندوستان مرا اک "دولت" ہے
بھوکا اس کو کہنا اک توہین ہے اور اک تہمت ہے

بھوکا ہندوستان کو کہنا آگاہی کی شان نہیں
بھوک ہے یہ روحانیت کی، بھوکا ہندوستان نہیں

قطب منارہ، جامعِ دہلی، اور ہو باقی "تاج جہاں"
ماضی کی عظمت کا گوشے گوشے میں ہو راج جہاں

امرتسر کا گرد وارہ ہو، بندرابن کے مندر ہوں
جہاں مساجد اور شوالے انداز سے بڑھ کر ہوں

اب تک ہوں تاریخ کی رونق "ایلورا" کے غار جہاں
اب بھی "دولت باغِ جہاں" ہوں اور ہوں "شالامار" جہاں

شاہی قلعے، دہلی، لاہور، آگرے میں باقی ہوں جہاں
جمنا، گنگا، راوی، جہلم کیف آگیں ساقی ہوں جہاں

جس خطّے میں دودھ کے دریا، شہد کی نہریں جاری ہوں
عشق کے ہوں معراج سمندر حسن کی لہریں جاری ہوں

سینا ہاؤں میں جس کے اک بھیڑ ہمیشہ رہتی ہو
سیر کی اور تفریح کی جس میں روحِ رنگیں بہتی ہو

علم کی اور صنعت کی دولت سے گھر ہوں معمور جہاں
شعر اور گیت کے رس ساگر سے پھیل رہا ہو نور جہاں

کھیتوں سے سونے چاندی کی پیداوار ہو عام جہاں
غلّے اور میوے سے بھرے ہوں کوٹھے اور گودام جہاں

کیا اُس ملک کو بھوکا کہنے والے تنگ نگاہ نہیں؟
کیا وہ اپنی تنگ نگاہی سے اب تک آگاہ نہیں؟

ہند کو بھوکا کہنے والے خود افلاس کے مارے ہیں
روحانی افلاس نے یہ تو اپنے پاؤں پسارے ہیں

ان کو اپنی بھوک کے اصلی راز کی خود پہچان نہیں
بھوکے ہیں خود ہندوستانی، بھوکا ہندوستان نہیں

بھول گئے ہیں یہ مذہب کو دل میں خدا کی یاد نہیں
قرآں، وید، گرنتھ سے یعنی ان کے گھر آباد نہیں

ان پہ غلامی کی اک لعنت صبح و شام برستی ہے
یہ محکوم ہیں، امن و سکوں کو ان کی روح ترستی ہے

دان اور پُن خیرات اور صدقہ دینے کا احساس نہیں
دولت تو ہے اب بھی لیکن ایماں ان کے پاس نہیں

جو اپنے رزّاق کو بھولے رزق اسے دے کون یہاں؟
جس کے پاس نہیں کھانے کو وہ بھی ہے فرعون یہاں

میلے ٹھیلے کھیل تماشے اب بھی قائم ہوتے ہیں
شاہد اور شراب سے ہو کر مست ہزاروں سوتے ہیں

بھوک ہی ہے اک آخری چارہ بیکاروں بدکاروں کا
بھوکا رہنا ہی بہتر ہے غفلت کے بیماروں کا

بھوک ہی کیا، اب موت بھی ان پر اپنا رنگ جمائیگی
یہ تو مٹی کھا نہیں سکتے، مٹی ان کو کھائے گی

چہرے ہیں مرجھائے ہوئے اور ہاتھ میں دل کی تاشیں ہیں
اُٹھتے بیٹھتے مُردے ہیں، یہ چلتی پھرتی لاشیں ہیں!

(دسمبر ۱۹۴۳ء)

اپنی اپنی جگہ

اَلا اے خُردہ گیر و نکتہ چیں، کم بین و کم مایہ!
سمجھتا ہوں تری فکر و نی کی پست مغمومی

زمین و آسماں کا ہے تفاوت تجھ میں اور مجھ میں
مجھے عرفاں میسر ہے، تجھے دانش کی معدومی

ہے تیرا مولد و ماحول دہقانی و قصباتی
مگر مینو سوادِ تاج ہے میری جنم بھومی

مری تقدیر میں شہرت بھی عظمت بھی قیادت بھی
تری قسمت میں ناکامی و گمنامی و محرومی

قلم سے میں حکومت کر رہا ہوں قلبِ انساں پر
کسی کو بھی نہیں محسوس لیکن اپنی محکومی

ابھی تو یاد ہوگا تجھ کو وہ سجدہ عقیدت کا
کہ تو نے حیلہ لغزش سے میری کفشِ پا چومی

سُن اے نوحہ گرِ بد اختری و سعیِ لاحاصل
کسی تدبیر سے جاتی نہیں تقدیر کی شومی

ہوئی حاصل نہ تیری روح کو تسکین و یکسوئی
بنا کر مادّی محور، بہت ناچی بہت گھومی

درخشانی بھلا کیونکر ہو ضربِ برق سے پیدا
مزاجِ ابر میں ہے فطرتاً اک تیرہ مقسومی

دوامی گریہ افشانی ہے، رونا عمر بھر کا ہے
گلوگیری کی شاہد ہے یہ تیری خستہ حلقومی

تری ہیئت سے ظاہر ہے خباثت تیرے باطن کی
فریب اتقا ہے تیری ریشائیل معصومی

ترے ہم مشرب و ہم سلسلہ ہیں بوم اور احمق
مرے ہم مجلس و ہم مرتبہ شیرازی و رومی

تو جس کا نام لیوا ہے مٹا جاتا ہے نام اُس کا
حماقت ہے یہ تیرا اِدعائے حیّ و قیّومی

کوئی سنتا نہیں تیری مگر برا رہا ہے تُو
ہنسا دیتا ہے مجھ کو یہ ترا اندازِ مظلومی

جو خادم ہے، وہ ہی مخدوم اپنے ملک و ملّت کا
بغیر خدمت و طاعت کہیں ملتی ہے مخدومی!

جُھکا دے اپنا سر "قصر الادب" کے آستانے پر
نہیں اس کے سوا درمانِ محرومی و مغمومی

ستمبر ۱۹۴۳ء

بوڑھی بھکارن

لکڑی ٹیکے کمر جھکائے اپنے رستے جاتی ہے
آنے جانے والوں کی ٹکرے جان بچاتی ہے

فاقوں کی ماری ہے بڑھیا منہ میں بھی آواز نہیں
دنیا اس کو دیکھ رہی ہے کوئی مگر دمساز نہیں

بھاری بھاری جیبوں والے صحت مند و پیٹ بھرے
کترا کر گزرے جاتے ہیں بچ کر سائے سے اس کے

مانگ رہی ہے بھیک آنکھوں سے گو ملنے کی آس نہیں
اندھے رہگیروں کو اس کی حالت کا احساس نہیں

پاپی پیٹ لئے پھرتا ہے دہشت ناک اندھیروں میں
بیر حمی اور نفرت کے ناپاک اور گندے ڈھیروں میں

اس نے کتنے دور انسانی خود غرضی کے دیکھے ہیں
کتنے موسم گرم اور ٹھنڈے اس پر یکساں گزرے ہیں

خاکے اس کی غربت کے کچھ تاریخی افسانے ہیں
پیٹ ہے خالی لیکن غم کے بار سے بوجھل شانے ہیں

آنکھوں والوں کو اس بھوکی دکھیا کی پہچان نہیں
اور ہیں سب انسان کے بچے ایک یہی انسان نہیں

میلی چادر سر سے ڈھل کر جب شانوں پر آتی ہے
کانپتے ہاتھوں سے وہ اسکو پھر سر تک لے جاتی ہے

کیا ملکی تہذیب کا ہے اس حالت میں بھی پاس اسے
کیا اپنے عورت پن کا اس وقت بھی ہے احساس اسے

اے ہندی خاتون تری اس شرم و حیا کے کیا کہنے
شرم و حیا کے ساتھ ہی پھر اس صبر و رضا کے کیا کہنے

لیکن تو جس انسانی تہذیب سے اتنا ڈرتی ہے
وہ تہذیب بھی کیا سڑکوں پر تیری پروا کرتی ہے؟

بھوکے پیٹ گزر یا ننگے سر اس کو پرواہی نہیں
محتاج اور غریبوں کا اس ملک میں کچھ رجا ہی نہیں

جو جتنا محتاج ہے وہ، اتنا ہی ستایا جاتا ہے
چاندی کے تھالوں پہ یہاں سونا برسایا جاتا ہے

ہٹے کٹے جواں گداگر ان کے ہاتھوں پلتے ہیں
فرضی چندہ لینے والے چندہ لے کر ٹلتے ہیں

کھیل تماشوں میں ان کی جیبیں خالی ہو جاتی ہیں
سیر سپاٹوں میں ان کی راتیں کالی ہو جاتی ہیں

اس ایثارِ بے جا اور اسراف کی پیداوار ہے تو
دولت کی تقسیم غلط ہے اسی لئے نادار ہے تو

حقداروں کو حق نہیں ملتا ناحق پونجی لٹتی ہے
گھر میں چولہا ٹھنڈا باہر آتش بازی چھٹتی ہے

ظاہر و باطن ایک نہیں ہے مکر و ریا کے بندوں کا
اپنی ہی تن آسانی ہے مقصد ان کے دھندوں کا

پھاڑ یہ میلی چادر آنکھیں کھول زبان کو جنبش دے
یہ پتھر کے ڈھیر ہیں ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر لرزش دے

ٹوٹی لکڑی پھینک بھکارن تن کے سیدھی آ کے
اِن پر طاقت سے غالب ہو ان کی لگ پہچان کے آ

قانون و تہذیب و مذہب طاقت ہی ہے آج یہاں
لکڑی سے کیا کام چلے گا ڈنڈے کا ہے راج یہاں

حق غربت کا اور بڑھاپے کا ان سے للکار کے لے!
سیدھے ہاتھ سے دیں نہ اگر خیرات طمانچہ مار کے لے!

(۲۰ اگست ۱۹۳۴ء)

مراحل

یہ غرور و ناز بے جا، یہ غلط نیاز مندی
کہیں ضیغمیِ مطلق، کہیں صرف گوسفندی

یہ تضاد سیرتوں کا، یہ نفاق نیتوں کا
جو کسی میں بیخودی ہو تو کسی میں خود پسندی

جو بہت بڑھا چڑھا تو، تو فلک کی رفعتوں تک
تری پستیوں کی مظہر، تری فکر کی بلندی

تو ہے مضطرب ابھی سے، تجھے یہ خبر نہیں ہے
کہ "ہے یک ہزار سالہ" ترا عہدِ مستمندی

قدم آزما چلے گی جو یونہی ہوائے مغرب
ابھی اور ہوں گے گمراہ عربی و تاشقندی

جو مری نظر سے دیکھے، تو ہوائی شعبدے ہیں
یہ نمائشِ عساکر، یہ نشاطِ قلعہ بندی

جو بقائے نوعِ انساں ہو خرابِ قتل و غارت
تو ہے اصل میں ہزیمت، یہ نہیں ہے فتحمندی

تجھے ذوقِ علم دے کر نہ مجالِ آگہی دی
ترے ظرف کو مبارک یہ خرد کی نادہندی

نہیں دل جو تیرا محرم، تو یہ دہر ہے جہنّم
کہ بغیرِ سوزِ حکمت کسے آئی ہے سپندی

یہ تجمّل و تحکّم ہیں تری فنا کے ساماں
یہ نہیں حصارِ سنگیں، یہ فقط ہے شیشہ بندی

کئی قرن بعد ہوگا تجھے پھر عروج حاصل
جو یہ مرحلے ہوئے طے بہ کمالِ ہوشمندی

اگست ۱۹۴۳ء

نیا محاذ

تو اپنی ذات میں تازہ صفات پیدا کر
ہو جس میں شانِ بداعت وہ ذات پیدا کر

کمالِ علم و عمل کی حدود اور بڑھا
نئے شعور، نئی حسیات پیدا کر

ہے مشکلات کا بڑھنا ہی وجہِ آسانی
جو حل نہ ہو سکیں، وہ مشکلات پیدا کر

ہے سوز دل کو میسر، تو تیرگی کیسی!
نہ چھائے جس میں اندھیرا وہ رات پیدا کر

قدیم مذہب و ملت سے گر نہیں تسکیں
تو پھر نئی کوئی راہِ نجات پیدا کر

نگاہِ تیز سے لے کارِ ضربتِ محمودؔ
قدم قدم پہ نئے سومنات پیدا کر

انھیں سے ذوقِ تلاشِ خدا ہوا پیدا
حرم میں اور جبل اور لات پیدا کر

ابھی حیات پہ بس ہے نہ موت پر قابو
کچھ اور درکِ حیات و ممات پیدا کر

نظامِ زیست میں ہے موت بدترین قانون
نیا طریقۂ امن و ثبات پیدا کر

ہے تنگنائے جہاں میں محال آزادی
وسیع اور کوئی کائنات پیدا کر

نہیں محبتِ شخصی عیارِ خُلقِ عظیم
بلند حوصلۂ التفات پیدا کر

جو واقعات میں اب زندگی نہیں باقی
تو زندگی میں نئے واقعات پیدا کر

تو اپنے حال ہی میں مست ہے، تو بزدل ہے
مجالِ سرخوشیٔ شش جہات پیدا کر

زبان و فکر کی آزادیاں ہیں تجھ کو نصیب
جو ہو کسی میں نہ پیدا، وہ بات پیدا کر

مذاقِ کہنہ سے، ہے فتحِ زندگی دشوار
کوئی جدید محاذِ حیات پیدا کر

۱۴ر جون ۱۹۴۴ء

چاند پر تنقید

چاند سادہ ہے اسے سادہ نہ ہونا چاہیئے
چاند ٹیڑھا ہے اسے ٹیڑھا نہ ہونا چاہیئے

یہ مدوّر ہے، مربع یا مثلّث کیوں نہیں؟
اس میں اک دھبّہ ہے، یہ دھبّا نہ ہونا چاہیئے

ایک ہی حالت میں رہنا چاہیئے خورشید و آ
بدر بنتے ہی زوال اس کا نہ ہونا چاہیئے

ہو نظر محرومِ رویت بیشتر وقتِ طلوع
حجم اس کا اس قدر پتلا نہ ہونا چاہیئے

کیوں نہ یہ مشرق سے ہو پیدا سورج کی طرح؟
سمتِ مغرب سے اسے پیدا نہ ہونا چاہیئے

چاہیئے سطحِ فلک پر اس کو پیہم دوڑنا
اس کی رفتار اتنی آہستہ نہ ہونا چاہیئے

اس کے ہالے میں دھنک کے چاہئیں نقش و نگار
اس کے پہلو میں کوئی تارا نہ ہونا چاہیئے

ہاتھ بچوں کے نہ آئے جب وہ چھونے کو بڑھیں
اتنی دُور۔ اور اس قدر اونچا نہ ہونا چاہیئے

شورشِ تنقید جب کتوں کی جانب سے بڑھے
اس کو ایسے حال میں چپکا نہ ہونا چاہیئے

اس میں ہے یہ نقص، یہ عیب اور یہ بیشی کمی
ایسا ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے

چاند پر تنقید کر کے ہے بہت خوش نکتہ چیں
ہے نظر میں اس کی یہ اک اختراعِ بہتریں

لیکن اس کو کیا خبر، جو چاند کا خلاق ہے
ہنس رہا ہے اس کی اس تنقیدِ بیجا پر کہیں

چاند پر تنقید کا اس کی نہیں کچھ بھی اثر
چاند کی مطلق نہیں اس سے نگاہیں شرمگیں

ہے بدستور اس کی ہیئت اور خرام و خامشی
نکتہ چیں سے کہہ رہا ہوں میں ۔ اَلالے خُردہ بیں

چاند پر کیوں کر رہا ہے احمقانہ اعتراض
چاند حسبِ تبصرہ جب تو بنا سکتا نہیں

۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء

پھوٹ کا گیت

بین الاقوامی سازِ شکستہ پر

فسادوں کی معاون، خانہ جنگی کی میں بانی ہوں
دیارِ ہند میں اک "بین الاقوامی" نشانی ہوں

کرے کیا کام صلح و آشتی کی عارضی کوشش
کہ میں ہر دور میں اک ابتلائے جاودانی ہوں

کبھی مسجد مرا گھر ہے، کبھی مندر مرا مسکن
"تقدس" کے حجابوں میں "تکدر" کی کہانی ہوں

نہ جانے شعلہ خفتہ کی صورت کب بھڑک اٹھوں
وبالِ اتفاقی ہوں، بلائے ناگہانی ہوں

مجھی سے گرمیاں ہیں "مجلسِ اقوام" کی باقی
بہ ہر عنوان میں ہنگامہ دنیائے فانی ہوں

تسلط ہے مرا دست و زبانِ اہلِ محفل پر
کہیں پیغامِ تحریری، کہیں درسِ زبانی ہوں

مرے مسلک میں "آزادی" ہے اک افسانۂ مہمل
سبق آموزِ محکومی، حریفِ حکمرانی ہوں

ہوئی ہے پرورش میری دماغِ رہنمائی میں
الگ ہوں کارواں والوں سے پھر بھی کارِوانی ہوں

کوئی ہندوستاں میں میرا ہمسر ہو نہیں سکتا
میں تنہا جانشینِ "اتفاقِ آنجہانی" ہوں

کمالِ خاص حاصل ہو لگانے اور بجھانے میں
کہیں میں آگ کا طوفاں کہیں میں سرد پانی ہوں

مرے سیلِ تعصب سے اُبھرنا غیر ممکن ہے
عقائد کا طلاطم ہوں مذاہب کی جوانی ہوں

غنیمت ہے کہ مجھ پر فتح پا سکتا نہیں کوئی
بہ ایں شر و فتن معروفِ جشنِ کامرانی ہوں

نہ کیوں مغلوب ہوں یہ نوجوانانِ وطن مجھ سے
مئے دو آتشہ ہوں مرد افگن ہوں پرانی ہوں

کئے جائے زمانہ کوششیں میرے مٹانے کی
مرا مٹنا نہیں ممکن کہ جزوِ زندگانی ہوں

کروں میں غور شاید اس وطن سے کوچ کرنے پر
اگر ہر فرد یہ کہدے کہ "میں ہندوستانی ہوں"!

۹ ستمبر ۱۹۴۴ء

چراغانِ وطن

خوشی کیا ہو مجھے اے ہم نفس رسمی چراغاں سے
کہ گھبرایا ہوا ہوں مستقل گرمیِ حرماں سے

وطن پر میں مرے چھائے ہوئے ادبار کے بادل
نظر آتے ہیں منڈلاتے ہوئے ہر سمت طوفاں سے

یہ ہنگامی چراغاں کیا کرے گا روشنی پیدا
اندھیرے مل گئے ہیں قسمتِ ظلمت بداماں سے

مٹانا جن کا ناممکن ہوا ور ممکن نہ ہو مٹنا
وہ جلوے مانگتا ہوں میں فروغِ بزمِ امکاں سے

چراغ ایسے جلانا چاہتا ہوں اپنی محفل میں
نہ آندھی سے بجھیں اور ہوں نہ ٹھنڈے ابرِ باراں سے

وطن کے جگمگانے کو وہ کرنیں ڈھونڈتا ہوں میں
براہِ راست ہو جن کا تعلق مہرِ تاباں سے

شوالے کا دیا ہو، یا چراغِ طاقِ مسجد ہو
رہے محفوظ موجِ انقلابِ تیرہ ساماں سے

فضا میں "اتحاد و صلح" کے آثار پیدا ہیں
نیا رشتہ کوئی ہونے کو ہے جیب و گریباں سے

مگر دل کو نہیں تسکین اور اس کا سبب یہ ہے
کچھ اندیشے ہیں مجھ کو گردشِ گردونِ گرداں سے

اُداسی کر رہی ہے بے سکوں "شامِ چراغاں" کی
تھے صبحِ عید کے انوار بھی کچھ نافروزاں سے

بظاہر مطمئن اہلِ وطن کو دیکھتا ہوں میں
نکلتی ہیں صدائیں ساز کی سوزِ رگِ جاں سے

مجھے لیکن نہیں ہے اعتبار ان کی مسرت پر
کہ میں واقف ہوں ان کے التہابِ داغِ پنہاں سے

چراغاں رات دن رہتا ہے اُن کے دل کی دُنیا میں
کبھی تاب و تپِ غم سے کبھی سوزِ فراواں سے

خدا وہ دن کرے ایسا وطن میں انقلاب آئے
جو صحرا ہیں پیدہ وہ بدل جائیں گلستاں سے

حقیقی روشنی امن و سکوں کی ہر طرف پھیلے
نشاطِ صبح کی تخلیق ہو شامِ غریباں سے

محبت کی محرم سے دیر تک شمعیں فروزاں ہوں
ضیا افروز ہو صحنِ کلیسا اس شبستاں سے

بجھا دیں سرد پھونکیں آشتی و صلح کی اس کو
چراغِ جنگ جو اب تک ہے روشن خونِ انساں سے

تو پھر اپنے وطن کی روح بن کر مسکراؤں گا
دیئے گھی کے جلا کر میں بھی دیوالی مناؤں گا

۲۶ ستمبر ۱۹۴۴ء

اِرتقا

ارتقا کیا ہے، زوالِ نفس کا ردِ عمل
قعرِ پستی سے بلندی تک پہونچنے کا محل

عالمِ بالا سے ہے ہستی میں پستی کا ورود
اس لئے پھر عالمِ بالا پہ ہے عزمِ صعود

اک فقط انسان کیا جس پر بھی پڑتی ہے نظر
ارتقا کی سامریت ہے اُسی پہ کارگر

چاہتا ہے ذرّہ بن جائے حریفِ آفتاب
قطرے کو ارمان ہے ہو جائے بڑھ کر موجِ آب

موجِ آب اس فکر میں ہے ابر بن کر ہو محیط
چاہتا ہے ابر ہو حدِ ثریا تک بسیط

رنگ و بو کا ارتقا ہیں بوستان و سبزہ زار
سبزہ زاروں کی تمنا ہے بنیں جنت وقار

وسعتِ صحرا کا سودائی ہے ظرفِ تنگِ خار
اور صحرا چاہتا ہے افتخارِ کوہسار

کوہساروں کو فلک بننے کی ہر دم جستجو
آسماں کو عرش بن جانے کی پیہم آرزو

آدمی انسان بنتا ہے بہ فیضِ ارتقا
اور ہے انسانیت قدوسیت کی ابتدا

الغرض مقصودِ جزو و کل ہے سعیِ ارتقا
کون ہے جس میں نہیں ہے جذبۂ نشو و نما

علم ہو یا عقل ہیجانِ ترقی سب میں ہے
روح ہو یا جسم امکانِ ترقی سب میں ہے

ارتقائے علم و صنعت انتہائے عقل و ہوش
دورِ حاضر میں بھی ہے حیرت فزائے چشم و گوش

جنگ کے سامان جو سائنس کا ہیں ارتقا
آج دنیا کی ہلاکت کا سبب ہیں جا بجا

ارتقائے عقلِ انسانی جنوں انگیز ہے
ہے خودی جس میں وہ اپنے وقت کا چنگیز ہے

اپنی حد پر آج پہونچا ہے خودی کا ارتقا
خود پرستوں کو یہ وحشت ہے کہ بن جائیں خدا

خاک زادے حملہ فرما سطوتِ اعلیٰ پہ ہیں
عالمِ صغریٰ کے حملے عالمِ کبریٰ پہ ہیں

قوت و سرمایہ کو سائنس سے ہے سازباز
ہر جگہ موجود ہے آج اک خدائے خانہ ساز

علم و حکمت کی ترقی امن کی حامی نہیں
اور پھر کیا ہے جو یہ تدبیر کی خامی نہیں؟

بربریت مشرق و مغرب پہ ہے چھائی ہوئی
آدمیت ہر طرف پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

ارتقا سے قتل اور غارت گری مقصود ہے
میں یہ کہتا ہوں کہ ایسا ارتقا مردود ہے

ہو رہی ہیں ارتقائی دور کی نسلیں ہلاک
اُڑ رہی ہے اس تمدن گاہِ انسانی میں خاک

آگ کی بارش فضا سے ہو رہی ہے خاک پر
لعنت ایسے ارتقائے تُند و وحشت ناک پر!

جب ہلاکت ہی ہلاکت ہو مآلِ ارتقا
ہے یہی بہتر کہ ہو جائے زوالِ ارتقا

بہارِ آزاد

صبا بہ اہلِ گلستاں رساں پیامے چند

در قفس بے سر و فکرِ سمن آباد خوشیم ——— ما بہ صبا دخوشیم
شاد باشید و منالید کہ ناشاد خوشیم ——— ما بہ صبا دخوشیم
باد دنیائے مسرت ہمہ در کارِ شما ——— گل و گلزارِ شما
داد خواہیم کہ در محبسِ بیداد خوشیم ——— ما بہ صبا دخوشیم
نہ غم و فکرِ نشیمن نہ سرِ برقِ تپاں ——— نہ چنیں و نہ چناں
ما بہ یکسوئیِ ظلماتِ قفس زاد خوشیم ——— ما بہ صبا دخوشیم
نہ زمیں در پئے، پامالیٔ خاکسترِ ما ——— نہ فلک بر سرِ ما
سینہ افگار و جگر خستہ و برباد خوشیم ——— ما بہ صبا دخوشیم
شامِ سنبل سحرِ نسترن و صبحِ سمن ——— بزمِ رنگینِ چمن

گُنَد از یاد فراموش کہ بے یاد خوشیم ——— ما بہ صیّاد خوشیم
مطرب و ساقیہ و انجمنِ ناز مباش ——— نغمہ ساز مباش
بہ ہمیں مشغلہ نالہ و فریاد خوشیم ——— ما بہ صیّاد خوشیم
در فضائے قفسِ تنگ جواں می گزریم ——— بسکہ بے بال و پریم
از غم و دغدغہ بال و پر آزاد خوشیم ——— ما بہ صیّاد خوشیم
درسِ صیّادی و کیادی و بیدادو جفا ——— می دہد صبح و مسا
حرف گیرید نہ بر ما کہ از اُستاد خوشیم ——— ما بہ صیّاد خوشیم
ذہن آزاد، دل آزاد، تصوّر آزاد ——— کارِ ما سہل فتاد
للہ الحمد کہ با خاطرِ آزاد خوشیم ——— ما بہ صیّاد خوشیم
لالہ خوش در دمن و گل بہ چمن بُو بہ سمن ——— شمع رخشاں بہ لگن
لیک سیماب بہ زندانِ بلا زاد خوشیم ——— ما بہ صیّاد خوشیم

نظر و خبر

مشرق کے کناروں پہ گھٹا دیکھ رہا ہوں ——— ٹھہرا ہوا طوفانِ بلا دیکھ رہا ہوں
سمٹی ہوئی رگہائے بقا پر ہیں نگاہیں ——— بڑھتی ہوئی امواجِ فنا دیکھ رہا ہوں
پھیلے ہیں وبا بن کے جراثیم خودی کے ——— تاراجیٔ مخلوقِ خدا دیکھ رہا ہوں
انفاس پہ طاری ہے جمود اور گرانی ——— ہیں قبضِ فضا نبضِ ہوا دیکھ رہا ہوں
مندر میں ہیں اغراض پرستوں کے ٹھکانے ——— مسجد میں قیامِ جُہلا دیکھ رہا ہوں
پرّاں بہ چمن زاغ کی صورت ہیں ہوائیں ——— بازی گریٔ اہلِ ہوا دیکھ رہا ہوں
خوش حالیٔ اصحابِ مظالم ہے نظر میں ——— پامالیٔ اربابِ وفا دیکھ رہا ہوں
اُس ملک کو جو خالقِ صد رنگ و نوا تھا ——— زیرِ اثرِ رنگ و نوا دیکھ رہا ہوں
بدلا ہوا آتا ہے نظر نقشۂ ماضی ——— ماحول کا عالم ہی نیا دیکھ رہا ہوں
جو جادۂ محفوظ تھی اُس راہ گزر میں ——— بیگانوں کا نقشِ کفِ پا دیکھ رہا ہوں

افراد پہ جو ہے اثر انداز بتدریج
تہذیبِ نوی کی وہ ادا دیکھ رہا ہوں

شاید نہ رہے مشرق و مغرب میں کوئی فرق
ایسے ہی کچھ آثارِ فنا دیکھ رہا ہوں

روز ایک نئی راہ پہ ہے قافلۂ قوم
نیرنگیٔ ذہنِ زعما دیکھ رہا ہوں

پھٹنے ہی کو ہے مادرِ مشرق کا کلیجہ
ہر ذرّے کو مجبورِ بکا دیکھ رہا ہوں

ہوں منتظرِ جلوۂ منشائے الٰہی
تقدیر کو منظور ہے کیا؟ دیکھ رہا ہوں

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۳ء

گُرزِ گراں

بر سرِ عالمِ گزراں

تیز کر اے عالمِ راہی کچھ اور اپنے قدم!
انتشارِ جادۂ ہستی سے دم گھٹنے لگا
راستے تاریک ہیں جوشِ خس و خاشاک سے
آگ کی سی تابشیں پیدا ہیں نبضِ خاک سے
اپنی عظمت سے ہیں خود مایوس دریا اور پہاڑ
ہے ہر اک معمورہ ویراں اور ہر بستی اُجاڑ
ہر قدم پر زندگی کا کارواں لٹنے لگا
ثبت کر افسانۂ ہستی پہ عنوانِ عدم

تیز کر اے عالمِ راہی کچھ اور اپنے قدم!

اُٹھ رہا ہے مشرق و مغرب سے طوفانِ حیات
خاک کے سینے پہ تصاں ہیں سمندر خون کے
مل رہے ہیں رات دن مٹی میں جوہر خون کے
عظمتِ انساں پہ ہے ادبار کا چنگل دراز
ہے مریضِ درد و جوعُ الارض دیو حرص و آز
اب کسی صورت نہیں امکانِ درمانِ حیات
زندگی اور موت میں آویزشیں ہیں دمبدم

تیز کر اے عالمِ راہی کچھ اور اپنے قدم!

اب نہیں تعمیر کی تدبیر کوئی کامیاب
اب تو اس دنیا کا تختہ لوٹ جانا چاہیے
اب خدا کو اک نئی دنیا بنانا چاہیے
وہ خدا جو ہے، مگر ہے اس طرح گویا نہیں
جس کو خود بربادیٔ مخلوق کی پروا نہیں
مصلحت! اب مصلحت خود ہی برافگندۂ نقاب
اعتبارات آپ اپنا توڑنے والے ہیں دم

تیز کر اے عالمِ راہی کچھ اور اپنے قدم!

سب یہ مہمل سلسلے ہیں التزامِ ماہ و سال
ہے یہ بے معنی سی گردش محورِ تقویم میں
ہو گیا ہے فرق پیدا حکمتِ تنظیم میں
اب یہاں چاروں طرف تخریب ہی تخریب ہے
نظمِ عالم ابتر و بے جان و بے ترتیب ہے
ہے یہ شاید عالمِ اجسام کا دورِ زوال
سازِ ہستی سے ہے پیدا نیستی کا زیر و بم

تیز کر اے عالمِ راہی کچھ اور اپنے قدم!

احساس کی کروٹیں

سال راہی کے بسترِ مرگ پر

سالِ راہی فقط اک رات میں مرجاتا ہے
دوسرے روز بدستور چلا آتا ہے

چند گھنٹوں کے مسافر کے لئے ماتم کیا!
واپس آنا ہی جسے اُس کی فنا کا غم کیا!

صفحۂ گردشِ ایام بدل جاتا ہے
چیز رہتی ہے وُہی نام بدل جاتا ہے

پھر وہی رات وہی دن وہی شام اور سحر
وہی لمحے، وہی ساعات، پہر اور پنچھتر

وہی فصلیں، وہی گرمی، وہی سردی کا مدار
وہی برسات وہی عہدِ خزاں، دورِ بہار

وہی سورج، وہی چاند اور وہی تارے بھی
وہی گردوں، وہی بُرج اور وہی سیارے بھی

پھر وہی بارہ مہینے، وہی تقریبیں پھر
پھر وہی دن وہی ہفتے، وہی تاریخیں پھر

جا کے دنیا سے یونہی کاش میں واپس آتا
مردہ در گور ہمیشہ کو نہ سمجھا جاتا

چند گھنٹوں کے لئے لوگ کہیں دفناتے
سحر نو کی طرح پھر مجھے واپس لاتے

کاش ملتی مجھے تقدیرِ حیاتِ مہ و سال
دیکھتا میں نئے ہر دور کا آغاز و زوال

اپنے ماضی کے گناہوں کی تلافی کرتا
ارتقا کی کوئی تدبیر اضافی کرتا

ناتمامی سے ادھورے جو رہے تھے مرے کام
دورِ ثانی میں یقیناً انھیں کرتا میں تمام

کاش سورج کی طرح ڈوب کے ہوتا میں طلوع
کاش ہوتا صفتِ ماہ مرا ختم و شروع

ہمارہتا یونہی دنیا میں بہاروں کی طرح
یونہی چھپ چھپ کے چمکتا میں ستاروں کی طرح

مجھ کو منظور نہیں روز کا مرنا جینا
یہی جینا ہے تو بیکار ہے ایسا جینا

ماہ و خورشید نہیں میں سحر و شام نہیں
ابھی آؤں، ابھی جاؤں یہ مرا کام نہیں

نہ مکانی نہ زمانی ہوں، نہ میں آنی ہوں
اشرف الخلق ہوں انسان ہوں لافانی ہوں

ہیں مہ و سال مرے صفحۂ ہستی کے ورق
میرے رنگین خیالات کی پرچھائیں شفق

ارض و افلاک مری ہستی و مستی کے غلام
کہکشاں، برق، ستارے مرے ادنیٰ خدام

میرے انفاس کے دو نام خزاں اور بہار
وہ مری برہمی، یہ میری شگفتِ افکار

میرے اوقات کی فہرست ہے تقویم جہاں
اس لئے اس کو ہے تجدید و تغیر شایاں

میں یہاں سیر کو آیا ہوں بعنوانِ سفر
اور یہ محفلِ عالم ہے مری راہ گزر

میں ہوا فائزِ منزل، تو یہ نظمِ سرِ راہ — مستقل طور پہ ہو جائے گا برباد و تباہ
سب یہ ساماں ہیں مرے دل کے بہلنے کیلئے — کر دیں ذوقِ تماشا کی بدلنے کے لئے
گردشیں ہیں، سحر و شام بکف میرے لئے — دورِ ایام ہے صد جام بکف میرے لئے

یہ مری بزم ہے اس بزم کا ساقی میں ہوں
جاودانی، ابدی، جاری و باقی میں ہوں

ابھی قدم نہ روک

انقلاب کو سُست گام دیکھ کر

ہونا نہ سُست گام ابھی اے دورِ انقلاب — باقی ہے تیرا کام ابھی اے دورِ انقلاب
تو نے بہائے خون کے دریا تو کیا ہوا! — خالی پڑے ہیں جام ابھی اے دورِ انقلاب

ہے تھوڑی دور محفلِ کسریٰ و جم ابھی
اے انقلاب روک نہ اپنے قدم ابھی!

باقی ابھی ہے رندی و مستی جہان میں — جنسِ ریا و زہد ہے سستی جہان میں
ہے عام خود نمائی و خود بینی و خود ی — پھیلی ہوئی ہے نفس پرستی جہان میں

ہیں ایک ہی ہوا میں عرب اور عجم ابھی
اے انقلاب روک نہ اپنے قدم ابھی!

تو میں خرابِ نشۂ پیکار ہیں ہنوز — ملکِ انتدابِ فنا سے بیزار ہیں ہنوز

انسان اتحاد کے خوگر کہیں نہیں　　دنیا میں اختلاف کے آثار ہیں ہنوز
موجود ہے نزاعِ کنشت و حرم ابھی
اے انقلاب، روک نہ اپنے قدم ابھی!

نازِ دنیاز خواجہ و مزدور عام ہے　　طبقہ جو کام کا ہے وہی خستہ کام ہے
ہے شخصیت ہنوز غرورِ وقار میں　　اک قوم دوسری کی ابھی تک غلام ہے
باقی ہے زندگی غلامی میں دم ابھی
اے انقلاب، روک نہ اپنے قدم ابھی!

آزادیٔ زبان و دماغ و سخن نہیں　　قدر و حمایتِ ہنر و علم و فن نہیں
تحسینِ باغباں میں دفاتر ہوئے سیاہ　　اک نظمِ مختصر بھی بحقِ چمن نہیں
محفوظِ دستِ غیر ہیں سیف و قلم ابھی
اے انقلاب روک نہ اپنے قدم ابھی!

چھایا ہوا غبارِ ہوس ہے حیات پر　　بارِ گراں ہر ایک نفس ہے حیات پر
مرنے میں ہے سکون نہ جینے میں لطف ہے　　قابو میں ہے نہ موت، نہ بس ہے حیات پر
یعنی جہاں تھے پہلے وہیں پر ہیں ہم ابھی
اے انقلاب روک نہ اپنے قدم ابھی!

سائنس ہے بنی ہوئی انسان کا خدا　　پستیٔ روح، مادیت کا ہے ارتقا
خوابوں کا سلسلہ ہے محیطِ دماغ و ذہن　　بیدار و خوشگوار نہیں ہے کوئی فضا
ہے برہم و علیل مزاجِ اُمم ابھی
اے انقلاب روک نہ اپنے قدم ابھی!

فکر اور ذہنیت میں صفائی نہیں ہنوز　　علم و نظر کی عقدہ کشائی نہیں ہنوز
طبعی تغیرات سے محروم ہے جہاں　　انساں کے دل میں تیری رسائی نہیں ہنوز
منزل تری ہے دُور خدا کی قسم ابھی
اے انقلاب روک نہ اپنے قدم ابھی!

حکمتِ انسانی کو چیلنج

کل جو کچھ کام کئے تو نے بصد نام و نمود
آج باقی نہیں اُن کا تری دنیا میں وجود

نعمتیں کل جو ترے خوان پہ تھیں کھائی گئیں
آج وہ صرف خیالوں میں ترے پائی گئیں

عشرتیں تھیں جو سرِ بزم طربِ خواب ہوئیں
لذتیں کل جو اٹھائی تھیں وہ سب خواب ہوئیں

ابھی وہ لمحہ جو تھا ساز تری ہستی کا
بن گیا مقبرۂ راز تری ہستی کا

سلسلے ہیں تری ہستی کے سرابوں کی طرح
روز و شب گزرے چلے جاتے ہیں خوابوں کی طرح

کیا اسی ہستیٔ موہوم پہ تو راضی ہے ؟
حال کچھ بھی نہیں، جو کچھ ہے فقط ماضی ہے

علم و حکمت پہ ہے دنیا میں بہت ناز تجھے
کہتے ہیں معرفت آموز و فنوں ساز تجھے

فلسفہ زور ہے، سائنس ہے قوت تیری
فیضِ حکمت سے ہے دُنیا پہ حکومت تیری

کھیلتی ہے ترے ہاتھوں میں حیات و ممات
آب و خاک اور ہوا پر ہیں ترے اقدامات

جنگ اور چنگ ہیں دو رنگ تری فطرت کے
لیکن ان دونوں پہ غلبے ہیں فنائیت کے

کبھی دیتا ہے ہوا شورشِ پیکار کو تو
روک دیتا ہے کبھی فوج کی یلغار کو تو

مستقل ہیں ترے جذبے نہ دوامی ترے کام
بے سکونی میں تسلسل نہ سکوں میں ہے دوام

بات یہ ہے کہ نہیں وقت پہ قبضا تیرا
علم ناقص ہے تخیّل ہے نکما تیرا

صبح پر بس ہے نہ ہے شام پہ قابو تیرا
اختیار رات میں مغلوب ہے پہلو تیرا

کسی تدبیر سے دورِ سحر و شام کو روک!
روک سکتا ہے تو اس گردشِ ایام کو روک!!

انقلاب زندہ باد!

"تم سلامت رہو مرتے رہیں مرنے والے"

شام نے خونیں کفن اس پر جو ڈالا بھی تو کیا
صبحدم پھر ہے وہی جاہ و جلالِ آفتاب

شاخِ گل پر جن کو ہوتی ہے نصیب افسردگی
پھر انھیں رنگینیوں میں مسکراتا ہے گلاب

موت کی گنجائشیں دورِ تسلسل میں نہیں
موت کیا ہے؟ صرف ہنگامی دو قتی ایک خواب

چاہتی ہے جس سے لے لیتی ہے فطرت اپنا کام
وہ سمندر کی ہوں موجیں یا ہو خشکی یا سراب

جب بلا انگیز ہو جاتا ہے رنگِ تیرگی
رات کے چہرے پہ دن کا ڈال دیتے ہیں نقاب

جب قیامت خیز ہو جاتی ہیں دن کی تابشیں
ظلمتِ شب سلب کر لیتی ہے اس کا التہاب

تشنگی سیراب ہونے کی دلیلِ خاص ہے
شیشہ ہو جاتا ہے خالی جب تو بھرتے ہیں شراب

انقلابِ حسن کا ہے ایک روشن معجزہ
ہو وہ یوسف کا بڑھاپا یا زلیخا کا شباب

ہوتا رہتا ہے بہر لمحہ زمانہ منقلب
باوجودِ سعیِ نا ممکن ہے اس کا سدِباب

مٹتی رہتی ہیں معین وقت پر شخصیتیں
جن کا اس دنیا میں پھر پیدا نہیں ہوتا جواب

ہار جاتا ہے یہاں ہٹلر سے پہلے روز ویلٹ
جیت میں کوئی نہیں فرعون یا افراسیاب

فی الحقیقت جیت اس دنیا میں ہے مقصد کی جیت
جیت میں وہ ہیں جو ہیں مقصد میں اپنے کامیاب

مرنے والے مر گئے اور ان کے جذبے آج بھی
سینۂ ہستی میں ہیں آتش فروزِ اضطراب

کوئی معنی ہی نہیں رکھتی فنا اجسام کی
جبتک اس دنیا میں ہے موجود روحِ انقلاب

ہمالہ کی چوٹی سے

کہر ہر سو کوئی، ظلمات بداماں کوئی
نہیں دنیا کی فضا آج درخشاں کوئی

اپنی منزل سے جو محرومِ ہیں اور گم شدہ راہ
نہیں اُن قافلے والوں میں حدی خواں کوئی

مطمئن ذاتِ خدا ہو تو ہو لیکن اس وقت
جو پریشاں نہیں ایسا نہیں انساں کوئی

روحِ عالم مجھے مجروح نظر آتی ہے
وقت کی جیب میں ہے دشنۂ پنہاں کوئی

ہو گئی عام پرستاریٔ شیطاں اتنی
جیسے باقی ہی نہیں بندۂ یزداں کوئی

جس طرف دیکھیے تخریب ہی بربادی ہے
یعنی دنیا کو فنا ہونے کی آزادی ہے

اے کہ سرگشتۂ اغراض ہے تو خود کار ہے تو
اے کہ سرشارِ خوشی سرخوشِ پندار ہے تو

اپنی تدبیر پہ عزہ ہے سیاست پہ غرور
کیا ارادوں سے مشیت کے خبردار ہے تو؟

تیرے تعمیر کے ہاتھوں سے فنا کا ہے نظام
یہ بھی ہے اک روشِ جبر کہ مختار ہے تو

وہم میں اپنی بقا کے ہے فنا آمادہ
پستیٔ موت کے چنگل میں گرفتار ہے تو

ہے اگر عزمِ بقا توڑ طلسمِ پندار
کر یہ اقرار کہ ناواقفِ اسرار ہے تو

سیکھ حدِ بشریت میں نمایاں ہونا
پھر کھلے گا کہ بڑی چیز ہے انساں ہونا

پیروی روس کی، جاپان کی تقلید نہ کر
ماسوا اللہ کسی اور کی تائید نہ کر

جہل و الحاد پہ ہو جس کا مدارِ تبلیغ
کبھی اُس علم سے اصلاح کی امید نہ کر

غور اور فکر سے کر تجزیۂ طرف ضمیر
تبصرہ نفس پہ کر عقل پہ تنقید نہ کر

مادیت پہ شرف روح کو ناممکن ہے
حکمت و فلسفہ سے کوششِ تردید نہ کر

تو چھتیں عالمِ بالا کی نہیں چھو سکتا!
ابھی چوٹی بھی ہمالا کی نہیں چھو سکتا!!

شملہ کانفرنس

بگڑ جاتے ہیں بن کر میری آزادی کے منصوبے
مجھے بھی ہم نفس احساسِ رنجِ ناتمامی ہے
وطن بھی اس مسلسل کوفت کو محسوس کرتا ہے
نصیبِ ذہن یہ جو مستقل اک تلخ کامی ہے
سببِ ناکامیٔ پیہم کا میں تو یہ سمجھتا ہوں
کہ ہے تدبیر بھی ناقص ارادوں میں بھی خامی ہے
سرِ میداں بس اک رسمی تگ و دو ہے کہ ہے جاری
شریکِ کارواں اقوام کی بد انتظامی ہے
مکدر نیتِ اجماع ہے اوہامِ باطل سے
مسلّط محشرِ افراد پر یاسِ دوامی ہے
مجالس سے یہاں جز شور و غوغا کچھ نہیں حاصل

سیاست کی فضاؤں میں دخیلِ کارِ عامی ہے
بھلا یہ قافلہ پہنچے گا کیوں کر اپنی منزل تک؟
وہی سستیِ رفتار اور وہی نازک خرامی ہے
وطن کے متحد مقصد سے کچھ مطلب نہیں ان کو
یہاں ہر شخص اپنی شخصیت ہی کا پیامی ہے
زباں ہے تیز و طرّار اور قدم مفلوج و بے قابو
اسی کا نام کیا راہِ طلب میں تیز گامی ہے؟
نہ کر محدود نظروں کو اگر آسودہ ہونا ہے
"مقامِ آسودگی" کی شرطِ اوّل لامقامی ہے
تجھے اس قومِ مغرب سے ہوس ہے ملک گیری کی
جو ہفت اقلیم پر قبضہ جما لینے کی حامی ہے
حکومت مختلف قوموں پہ کرنا کھیل سمجھا ہے!
ابھی تو اختلافِ باہمی خوئے گرامی ہے
اذاں شملے پہ دے یا سنکھ پھونک اپنا ہمالہ پر
مگر اے مردِ ہندی تیری قسمت میں غلامی ہے!

(جولائی ۱۹۴۵ء)

زوالِ عالم

ارتقا پر اپنے آ پہونچی ہے بزمِ کائنات
ہے خدا بننے پہ مائل منکرِ ذات و صفات
صورِ محشر ایک "ایٹم بم" کی ہے صوتِ مہیب
ہے شعاعِ موت سے جبروتِ عزرائیلؑ مات
غزنوی کے پے بہ پے حملوں کی اب حاجت نہیں
ایک لمحے کی مہم ہے اب سقوطِ "سومنات"
اب سنان و خنجر و شمشیر ہیں جنسِ فضول
اب فقط سائنس پر موقوف ہے جنگِ حیات
اور یہ آثار ہیں دراصل آثارِ زوال
"ہر کمالے را زوالے" ہے یہ اک مشہور بات

فصلِ ہستی در ہوائے گلستانِ دیگر است
ذہنِ فطرت محوِ تعمیرِ جہانِ دیگر است
صاحبِ تدبیر ہو یا صاحبِ علم و کمال
اب فقط ہے زیستی و موت ہی تیرا مآل
دورِ عالم پھر نئی کچھ کروٹیں لینے کو ہے
بے نیازِ رنگِ مستقبل نظر آتا ہے حال
کیوں نہ دنیا نے کیا پہلے وہ آئیں اختیار
جس سے رکتا انقلاب اور جس سے ٹل جاتا وبال؟
جنگِ عالم کو سمجھتا ہے قریب المختتم تو
ہے علیٰ وجہ البصیرت اور کچھ میرا خیال
ہے خودی انساں کی بربادی انساں کی دلیل
ہے کمالِ علم و دانش وجہِ تکمیلِ زوال
انتہا در ابتدائے کار و پیش است و بس
در پسِ ہنگامہ ہا ہنگامِ خاموشی ست و بس

ستمبر ۱۹۴۵ء

وقت کی نبضیں

سازگاری کا نہیں اے مطربہ آغاز ابھی
ساز چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

جنگ کے آتش فشانوں کی دبی چنگاریاں
کر رہی ہیں آج بھی دنیا میں شعلہ باریاں
بڑھ رہی ہیں خواریاں، لاچاریاں، بیزاریاں
ہے مگر انسان میں باقی غرور و ناز ابھی،
ساز چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

خوابِ بیداری ہے طاری دیدۂ اقوام پر
ہیں وطن آزاریاں جاری وطن کے نام پر
جاگ اُٹھتا ہے نیا فتنہ نئے ہر گام پر

شورشیں ناسازیٔ عالم کی ہیں غمّاز ابھی
ساز چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

اب بھی طیّاروں میں ہر جانب جہنم ہیں رواں
غیر محفوظ اب بھی ہیں دشت و جبال و گلستاں
زندگی سہمی ہوئی ہے آشیاں در آشیاں
موت ہے ہر سو فضا میں مائلِ پرواز ابھی
ساز چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

اب خودی والوں کی دنیا میں خودی ہے حشر خیز
شخصیت سے شخصیت ہے آج سرگرمِ ستیز
آمریت کی صدائیں ہیں بزن! بشکن!! ابریز!!!
جستجوئے صید میں ہے فطرتِ شہباز ابھی
ساز چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

انتشارِ بزمِ عالم ہے مآلِ کشت و خوں
چارہ گر سودا زدہ ہیں عقل ہے صیدِ زبوں
ہو رہا ہے منتشر شیرازۂ امن و سکوں

اور منشائے الٰہی ہے بقیدِ راز ابھی
ساز چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

مطربہ، نغمے ترے اور ساز کا کیف و اثر
چاہیں تو رکھ دیں اُلٹ کر یہ بساطِ بحر و بر
اور اک دنیا نئی آباد ہو جائے — مگر
روحِ ہستی تک نہیں پہونچی تری آواز ابھی
ساز چھیڑے جا مزاجِ وقت ہے ناساز ابھی

(۵ر دسمبر ۱۹۴۵ء)

اے مجلسِ امن و سلام!

شاعرِ امن و سلام کا ایک مشورہ

پھر جمع ہوئے تجھ میں وہی آمر و مختار
تھے عرصۂ ہستی میں جو آمادۂ پیکار

تخریبِ جہاں کے یہ پرانے ہیں گنہگار
قوموں کو مٹا کر جو ہیں تعمیر کے حقدار

قوت سے حریفوں کی یہ گھبرائے ہوئے ہیں
چلنے کو نئی چال یہاں آئے ہوئے ہیں

یہ چاہتے ہیں عالمِ انساں رہے گمراہ
ذہنوں میں ابھی ناچ رہی ہے وہی جنگاہ

یہ امن کے داعی ہیں نہ ہیں امن کے حامی
ہے "پالیسی" کے تحت یہ سب نغز کلامی

ہیں مشرق و مغرب کی فضائیں ابھی برہم
جو آگ لگی تھی، ابھی وہ آگ نہیں کم

ہے امن کی صرف اس لئے یہ کوششِ مبہم
شعلے ہیں جو بھڑکے ہوئے بن جائیں "ایٹم"

ڈر ہے کہیں مُردوں کے نہ ہو جائیں مجسم
بن جائیں کفن ان کے نہ یہ فتح کے پرچم

بے چین ہیں یہ روح کو ان کی نہیں آرام
نظروں میں ہیں محفوظ ابھی مذبحِ اجسام

یہ اب بھی فقط اپنی بقا کے ہیں ہواخواہ
اور ان کو غلاموں کے پنپنے سے ہے اکراہ

پندار کا ہے ان پہ مسلط ابھی کابوس
یہ ہو نہیں سکتے کبھی انسان سے مانوس

یہ قیصر و خاقاں، یہ سکندر فر و جم جاہ
ڈرتے ہیں نہ ہو عرصۂ ہستی کہیں کوتاہ

جو حال ہے دُنیا کا وہ تجھ کو بھی ہے معلوم
اب کوئی نہیں چاہتا کوئی رہے محکوم

پہنچا دے انھیں شاعرِ مشرق کا یہ پیغام
ہیں امن کے حامی تو کریں کوششِ ابرام

آزادیٔ اقوام سے کیوں ان کو جنوں ہے
آزادیٔ اقوام ہی دُنیا کا سکوں ہے

تا چند یونہی موردِ بیداد رہے گا؟
انسان ہے آزاد اور آزاد رہے گا

جنوری ۱۹۴۶ء

اے شاعرِ امن و سلام!

مجلسِ امن و سلام کا جواب

اے شاعرِ مشرق! مجھے سب حال ہے معلوم
تیری ہی طرح میں بھی ہوں افسردہ و مغموم

ہاں میری نگاہوں میں ہے مستقبلِ عالم
آزادیٔ انساں کا وہ اڑتا ہوا پرچم

لیکن ابھی تا دُور مسلط ہے سیاہی
آنے کو ہے دنیا پہ کوئی اور تباہی

آثار ہلاکت کے عیاں دیکھ رہی ہوں
اُٹھتا ہوا اک سُرخ دھواں دیکھ رہی ہوں

آفاق پہ ہیں چھائے ہوئے سخت اندھیرے
شیطان اندھیروں میں ہے ڈالے ہوئے ڈیرے

خاکسترِ اقوام میں شعلے ہیں جو پنہاں
ہونے کو ہیں پھر وقت کی پھونکوں سے فروزاں

یہ کوششیں بیکار ہیں امن اور سکوں کی
میں بھی انھیں اک نوع سمجھتی ہوں جنوں کی

ہوتا نہیں محسوس بدل جاتی ہے دنیا
ہر لمحہ بہت دُور نکل جاتی ہے دُنیا

یہ حکمتِ امروز نہیں ضامنِ فردا
حالِ سحرِ نو کا ہے، ہر رات کا پردا

دنیائے حوادث میں سلام اور سکوں کیا
اک حال پہ رہتی نہیں قائم کبھی دنیا

قوموں کے ابھی قوموں پہ جاری تھے مظالم
اب قوتوں سے قومیں ہوں گی متصادم

وقفہ ہے نئی جنگ کا یہ فرصتِ ایام
صد حشر در آغوش ہے ہر صبح، ہر اک شام

یہ صیدی و صیاد نہ یہ دام رہے گا
باقی فقط اللہ کا اک نام رہے گا

آزاد جب اس قید سے ہو جائے گی دُنیا
آزاد کچھ انسان نئے پائے گی دنیا

انسان وہ جب تک رہے آزاد رہیں گے
بٹ جائیں گے قوموں میں تو برباد رہیں گے

"دنیا یونہی ناشادیوں میں شاد رہے گی"
"برباد کیے جائے گی، آباد رہے گی"

سرحدِ ہندوستاں سے اک پیام

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں
وقارستانِ پیشاور میں تازہ میہماں ہوں میں
تجمل آشنائے قوت و تاب و تواں ہوں میں
مسلسل رفعت و شوکت کا نظارہ کناں ہوں میں
اسی کیفیتِ ذہن و نظر کا ترجماں ہوں میں

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں
یہاں کی ہر بلندی دعوتِ پرواز دیتی ہے
یہاں انساں کو خودداری صلائے ناز دیتی ہے
یہاں خاموشیٔ کہسار کا راز دیتی ہے

جدھر جاتا ہوں ہر وادی یہی آواز دیتی ہے
مجھے دیکھو کہ معمورِ رلئے کارواں ہوں میں

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں

یہ خطّہ بامِ فطرت سے قریں معلوم ہوتا ہے
کہ ہر ذرہ یہاں بالانشیں معلوم ہوتا ہے
وصالِ رفعت و پستی یہیں معلوم ہوتا ہے
فلک ہر سمت پابوسِ زمیں معلوم ہوتا ہے
زمیں بالیدہ ہو کر کہہ رہی ہے آسماں ہوں میں

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں

خدا کا اس جگہ انسان کو عرفان ہوتا ہے
شگفتہ روح اور تازہ یہاں ایمان ہوتا ہے
یہ وہ حد ہے جہاں پر ختم ہندوستان ہوتا ہے
تصور کو یہاں یک گونہ اطمینان ہوتا ہے
کچھ آگے بڑھ کے محوِ سطوتِ اسلامیاں ہوں میں

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں

مگر با ایں ہمہ اک برہمی بھی پائی جاتی ہے
بقدرِ تازگی افسردگی بھی پائی جاتی ہے
توانائی بھی ہے اور بیکسی بھی پائی جاتی ہے
خدا کی یاد بھی جھوٹی خودی بھی پائی جاتی ہے
اور ان صد رنگیوں سے فطرتاً حیرت بجاں میں ہوں میں

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں

بلندی انقلابِ وقت سے پامال ہے گویا
اسیرِ دام اک شہبازِ زرّیں بال ہے گویا
تہوں میں بادلوں کی تیرِ اقبال ہے گویا
سکوتِ آثارِ باقی کا زبانِ حال ہے گویا
کہ ماضی کے نقوشِ مضمحل کا پاسباں ہوں میں

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں

تضادِ حال سے نظارہ ہے کیا کیا گراں مجھ پر
تبسم ہے زمیں کو ہنس رہا ہے آسماں مجھ پر

کوئی اتنا نہیں کھولے یہ اسرارِ نہاں مجھ پر
اندھیرا بن کے چھا جانے کو تھیں حیرانیاں مجھ پر
کہ اک ذرہ چمک کر بول اٹھا ہندوستاں ہوں میں

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں

مرا پیغام سن لے ہند اس حدِ شمالی سے
نہیں اب مطمئن کوئی تری آشفتہ حالی سے
ملوکیت کو ہمدردی ہے تیری پائمالی سے
ابھرنا ہے تجھے شانِ جمالی و جلالی سے
بڑی پیغمبرانہ شان سے مژدہ رساں ہوں میں

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں

خدا کا ہاتھ نکلے گا انھیں جبروت گاہوں سے
نشیدِ امن آئے گی انھیں سنگین راہوں سے
مگر یہ راستے سیدھے نہ ہوں گے کج کلاہوں سے
انھیں ہموار کرنا ہے محبت کی نگاہوں سے
محبت کا یہ دعویٰ ہے نشاطِ جاوداں ہوں میں

شمالی سرحدِ ہندوستاں پر نغمہ خواں ہوں میں

نقوشِ مضمحل اک دن پھر ابھریں گے جواں ہو کر
یہ ذرے لیں گے اک انگڑائی پھر کوہِ گراں ہو کر
یہ گردِ کارواں اٹھے گی اک دن کارواں ہو کر
یہ جادے گونج اٹھیں گے صرفِ تکبیر اذاں ہو کر
کہے گا پھر مرا ہندوستاں "جنت نشاں" ہو نہیں

فروری ۱۹۴۶ء

منزل قریب تر ہے

اے اہلِ کارواں کیا تم کو بھی یہ خبر ہے؟ منزل قریب تر ہے
ہے ختم جادۂ شب اور آمدِ سحر ہے منزل قریب تر ہے

اللہ رے وہ جذبہ جو کامیاب نکلا
جادہ شناس نکلا مقصد مآب نکلا
بیدار کن مآلِ تحدیدِ خواب نکلا
لو مشرقِ طلب سے وہ آفتاب نکلا!

وہ آفتاب جس میں امید جلوہ گر ہے
———— منزل قریب تر ہے

کوسِ رحیل میں اب شورِ رواں نہیں ہے
آوازۂ جرس میں جوشِ فغاں نہیں ہے

بانگِ درا میں سوزِ برقِ تپاں نہیں ہے
اب نغمۂ رجز خواں تندیٔ گراں نہیں ہے

اب تو یہ مژدۂ نواس کی زبان پر ہے
———— منزل قریب تر ہے

جو شورشِ تمام محفل بنی ہوئی ہے
ہر گفتگو کا جزوِ حاصل بنی ہوئی ہے
لاحل جو ایک فکرِ باطل بنی ہوئی ہے
صدیوں سے جو حدیثِ منزل بنی ہوئی ہے

وہ داستانِ منزل فی الجملہ مختصر ہے
———— منزل قریب تر ہے

پرگرد سب پھریرے جھنڈوں کے صاف کر لو
تیغ و سنان و خنجر سب کو غلاف کر لو
وا ماندۂ سفر ہو کچھ اعتکاف کر لو
اور اپنے نقشِ پا کا خود بھی طواف کر لو

یہ نقشِ پا نہیں ہے تقدیرِ رہگزر ہے
———— منزل قریب تر ہے

اے اہلِ کارواں ہو تم پر سلام میرا
آسودگی مبارک ہے ختم کام میرا
ہوں رہنمائے منزل، شاعر ہے نام میرا
لایا ہے تا بہ منزل تم کو پیام میرا
پہلے جو ہم سفر تھا، اب حاصلِ سفر ہے
——— منزل قریب تر ہے

مارچ ۱۹۴۶ء

مادّیت

جاگ اے آتش فشاں، انسان کے سینے میں جاگ،
دل کے رنگ آلود، خواب آلود آئینے میں جاگ!!

ہے دلِ انساں ابھی روحانیت سے بے نیاز
ہے بدستور اس کے جذبوں میں نمودِ حرص و آز
بادشاہی کی ہوس
عالم پناہی کی ہوس
گرم ہے پتھر کا دل، انسان کا دل سرد ہے
نفس کا بازار گرم اور دل کی محفل سرد ہے
اس میں بھر دے بجلیاں
جاگ اے آتش فشاں!

تو ہوا سنسان جنگل میں شرر افشاں تو کیا!
چھا گیا کچھ بستیوں پر موت کا طوفاں تو کیا!
جاگ اُٹھے بحر و بر جاگا نہ یہ انساں تو کیا!
انسان کے سینے میں جاگ!

اس کا رشتہ مدتیں گزریں حقیقت سے نہیں
آدمی ہے اور تعلق آدمیت سے نہیں
خود غرض، خود آشنا
خود بین و خود سر، خود نما
حرص کا مارا ہوا ہے نفس سے مغلوب ہے
اس کا دل ٹھٹھرا ہوا ہے زندگی مرطوب ہے
کر شرر افشانیاں!
جاگ اے آتش فشاں!!

ہے تو یہ بندہ مگر کرتا نہیں ہے بندگی
اس میں ہے خوئے خودی اور نخوتِ اخوندگی
اس میں لاوے کی طرح سوئی ہوئی ہے گندگی
انساں کے سینے میں جاگ!

کوئی اس کے دل میں بھی صورِ محبت پھونک دے
اس کی ٹھنڈی خاک میں سوزِ حقیقت پھونک دے
جل جلا کر خاک ہو
اور صاحبِ ادراک ہو
آگ باطن کی بھڑک اُٹھے تو ٹھنڈا ہو مجاز
شمع بن جائے تو فطرت اس کی ہو پروانہ ساز
اب تو مطلق ہو دھواں
جاگ اے آتش فشاں!

اس کو ظلمت سے نہیں، ہو جلوۂ فطرت سے لاگ
لاگ سے دل کی لگا دے عالمِ باطل میں آگ
آگ بھی ایسی کہ جو بن جائے دُنیا کا سہاگ
انسان کے سینے میں جاگ!

اپریل ۱۹۴۶ء

مرے وطن کی فضائیں!

بجا کہ گرم و گراں ہیں مرے وطن کی فضائیں
غلط کہ شعلہ بجاں ہیں مرے وطن کی فضائیں

مرے وطن کی فضاؤں کا خون گرم و رواں ہے — مرے وطن کی فضاؤں میں زندگی کا نشاں ہے
مرے وطن کی فضاؤں میں آگ اور دھواں ہے — مرے وطن کی فضاؤں سے اضطراب عیاں ہے
فسانہ خیز و جواں ہیں مرے وطن کی فضائیں

سیاست اور ادب میں، مرے وطن کی حکایت — فضائے عیش و طرب میں مرے وطن کی حکایت
حبش میں روم و حلب میں، مرے وطن کی حکایت — عراق و شام و عرب میں مرے وطن کی حکایت
حیات بخش جہاں ہیں مرے وطن کی فضائیں

حیات بخش فضاؤں میں پھر یہ ذکرِ فنا کیوں؟ — ہلاکتوں کا بھیانک سماں محیطِ فضا کیوں؟
یہ بیم و یاس یہ خوف و ہراس ہوش رُبا کیوں؟ — یہ شورشیں، یہ کشاکش، یہ ابتری، یہ غنا کیوں؟
یہ کیوں رہینِ فغاں ہیں مرے وطن کی فضائیں

یہ کس کی لاش ہے جو صیدِ جورِ اہلِ وطن ہے؟ — یہ کس کی لاش ہے جو پائمالِ دشت و دمن ہے؟
یہ کس کی لاش ہے جو مسرتی گور و کفن ہے؟ — یہ کس کی لاش ہے جس پر ہجومِ زاغ و زغن ہے؟
یہ کس کی مرثیہ خواں ہیں مرے وطن کی فضائیں

ابھی ہے جوش و خروش و وداعِ ہوش کی خواہش — ابھی معاملہ ہے درمیانِ کاہش و کاوش
ابھی تو خون کے چھینٹوں سے ہے نظر کی نوازش — ابھی بعید ہے گلہائے صبح رنگ کی بارش
ابھی تو لالہ چکاں ہیں مرے وطن کی فضائیں

مگر یہ جوش و خروش اعتدال پا کے رہے گا — یہ خونِ زندگی نو کا رنگ لا کے رہے گا
وطن کا عالمِ افسردہ مسکرا کے رہے گا — اس انقلاب میں اک انقلاب آ کے رہے گا
سنو کہ مژدہ رساں ہیں مرے وطن کی فضائیں

اکتوبر ۱۹۴۶ء

تبدیلیاں

میلان بدلنے والا ہے، رجحان بدلنے والا ہے
بدلی ہوئی دُنیائے نَو کا انسان بدلنے والا ہے
افسانۂ ملک و ملت کے سب سانچے بدے جائیں گے
موضوع بدلنے والا ہے، عنوان بدلنے والا ہے
اس عالمِ امکاں میں اب تک جو ہو نہ سکا تھا وہ ہوگا
اب اپنی حدِ ممکن تک امکان بدلنے والا ہے
ہوش اور خرد کی دعوت ہے دل اور دماغِ عالم کو
اذہان میں ہوگی تبدیلی، بحران بدلنے والا ہے
وہ آئیں جو ہیں آزاد و نگر، کچھ کام کریں آگے بڑھ کر
ہٹ جائیں پُرانے بازیگر، میدان بدلنے والا ہے

کچھ کام نہ دیں گے یہ کہنہ آداب عبورِ دریا کے
کشتی باں سے کوئی کہدے طوفان بدلنے والا ہے
اب ساغر و مینا کے بدلے خوننابے رکھے جائینگے
محفل سے پہلے محفل کا سامان بدلنے والا ہے
شیطان کی اُمت اب اپنا سالار نیا تجویز کرے
اِس پاپ کی ماری دنیا کا شیطان بدلنے والا ہے
یارب اُمیدِ نو بن کر مغموم دلوں کو ڈھارس دے
مایوس پرستاروں کا ترے ایمان بدلنے والا ہے
سیماب بدلتی دنیا کی تغئیر پہ حیرت کیا معنی!
یہ عالمِ حادث ویسے بھی ہر آن بدلنے والا ہے

فروری ۱۹۳۶ء

افکارِ پریشاں

آج اِس کی ہے، کل اُس کی برنائے انقلاب
ایک مرکز پر کبھی دنیا ٹھہر سکتی نہیں
آگ دوزخ کی انھیں لاکر پلانی چاہیے
جن کی نیّت خون پینے سے بھی بھر سکتی نہیں
چند لمحے غورِ مستقبل پہ کر اُس ملک کے
ایک ساعت امن سے جس کی گزر سکتی نہیں
اپنی کمزوری پہ بھی طوفاں میں ہو جس کو غرور
ڈوب تو سکتی ہے وہ کشتی اُبھر سکتی نہیں
عالمِ بالا و پستی پر ہیں ناحق پورشیں
فطرتاً ترتیبِ ہستی کی بکھر سکتی نہیں

محفلِ اہلِ تدبر میں نہ کر سعیِ فریب
لومڑی شیروں کے نرغے میں بپھر سکتی نہیں
کیا مٹیں گے غارتِ افراد سے جذباتِ قوم
جسم ہو سکتے ہیں فانی روح مر سکتی نہیں
ماند کر سکتی ہیں تاروں کو شعاعیں مہر کی
اکثریت اقلیت کو ہضم کر سکتی نہیں
گر نہ ہو گی آج تو برباد ہو گی کل وہ قوم
جو خدا سے کھیل تو سکتی ہے ڈر سکتی نہیں
متحد ہو کر کریں جب تک نہ سب قومیں خیال
ملک کی حالت قیامت تک سدھر سکتی نہیں
کر حفاظت زندگی کی پھر بقا کی جہد کر
ٹوٹ کر پھولوں سے شاخِ گل سنور سکتی نہیں

مئی ۱۹۴۷ء

سیاسی غزل

راہِ طلب میں فرصتِ قطعِ سفر کہاں
کیا جانے اپنی شام کہاں ہو، سحر کہاں؟!

ہے نعرۂ نقیب کہ منزل ہے سامنے
یہ اک نویدِ نو ہے مگر معتبر کہاں!

پرچھائیں سی جو اک نظر آتی ہے دُور سے
یہ صرف گھر کا خواب ہے نادان! گھر کہاں؟

تسلیم ہے مجاز کی بازی گری مگر
ہے مطمئن نگاہِ حقیقت نگر کہاں!

دنیا کی وسعتیں ہیں فریبِ سکون و امن
ہو خستہ بھی اگر تو سرابِ نظر کہاں؟

ہیں فکر میں ہزار اندھیرے بھرے ہوئے
یعنی ابھی ہوئی شبِ غم کی سحر کہاں؟

اہلِ چمن ہیں مطمئن اور یہ خبر نہیں
صیاد اب بچھائے گا دامِ دگر کہاں؟

زخمِ نظر ہے معرکۂ "انڈونیشیا"
ہے "ایشیا" میں امن و اماں کا گزر کہاں

"برما" کے واقعات سے گھبرا رہا ہے دل
اب دیکھئے ہو شورشِ اربابِ شر کہاں؟

تقسیم بین لالہ و گل ہو گیا چمن
لے گی پناہ فطرتِ برق و شرر کہاں؟

ناسازگار سا نظر آتا ہے انقلاب
ہے انقلابِ وقت سے لیکن مفر کہاں؟

شاہنشہی سے مردِ مجاہد کو بیر ہے
اہلِ عمل کو فرصتِ تاج و کمر کہاں

اُچٹے گی بار بار ابھی کارواں کی نیند

امکانِ خوابِ سبز، سرِ رہگزر کہاں؟
ممکن ہے پھر ہو دورِ غلامی کی بازگشت
آزاد ہو گیا ہوں، مگر بال و پر کہاں!
ممکن ہے پھر جراحتِ کہنہ کی واشگفت
تسکین مجھ کو دے کے چلا، چارہ گر کہاں
"اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو دردِ عشق"
"رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں؟"

جولائی ۱۹۴۷ء